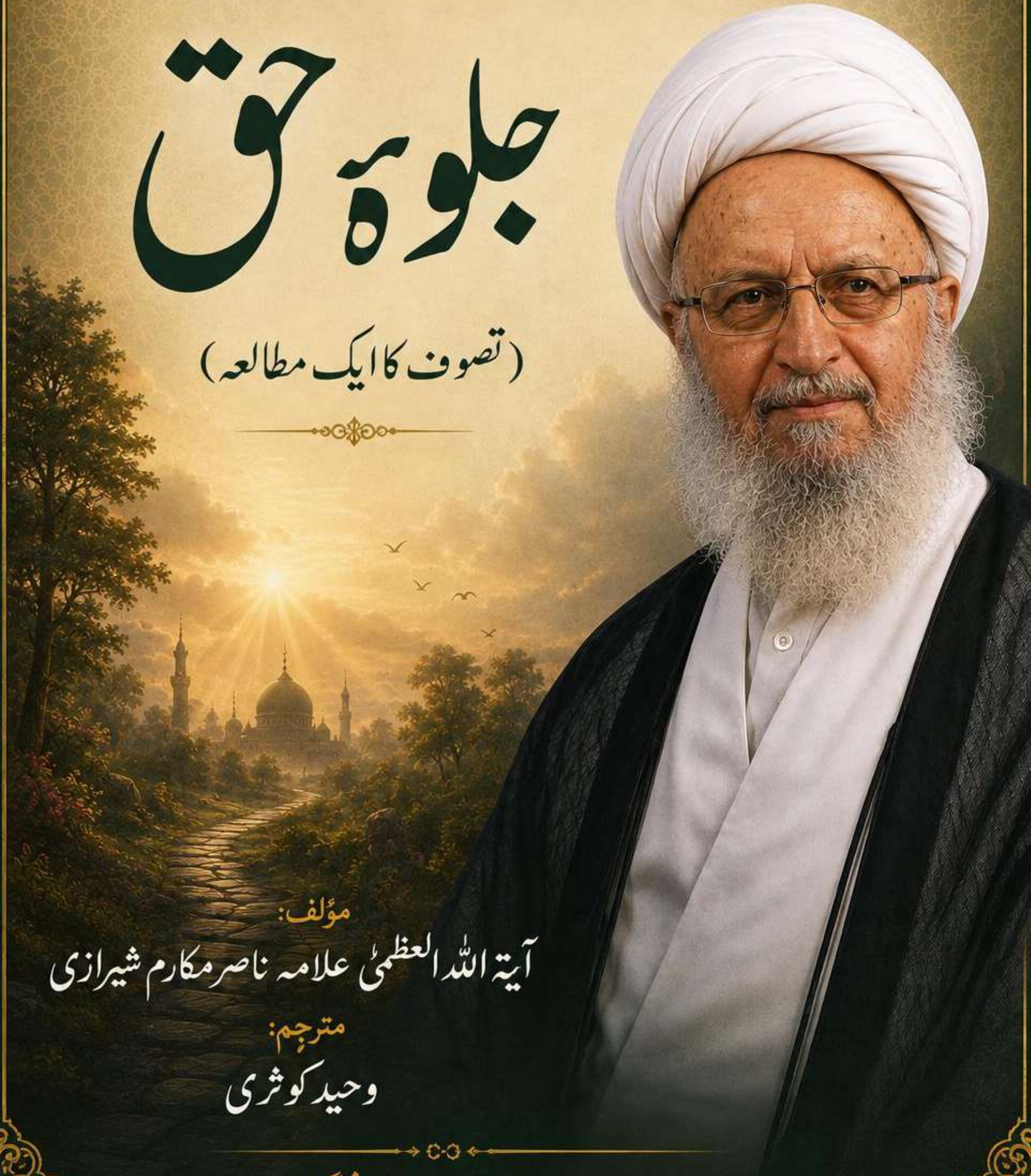
وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ . (سورہ یونس، آیت.100.)

ترجمہ: ”جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اللہ انہیں بدی میں مبتلا کر دیتا ہے۔“

جلوۂ حق

(تصوف کا ایک مطالعہ)



مؤلف:

آیۃ اللہ العظمیٰ علامہ ناصر مکارم شیرازی

مترجم:

وحید کوثری

ادارۂ حیدریہ ورجینیا (واشنگٹن)

وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ.(سورہ یونس، آیت 100۔)

ترجمہ: ”جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اللہ انہیں پلیدی میں مبتلا کر دیتا ہے۔“

جلوۂ حق

(تصوف کا ایک مطالعہ)

مؤلف: آیۃ اللہ العظمیٰ علامہ ناصر مکارم شیرازی

مترجم: وحید کوثری

ناشر: ادارۂ حیدریہ، ورجینیا (واشنگٹن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عنوانِ کتاب: جلوہٴ حق

مؤلف: آیۃ اللہ العظمیٰ علامہ ناصر مکارم شیرازی

محشی: حجۃ الاسلام داؤد الہامی

مترجم: وحید کوثری

طبع: اول

سالِ اشاعت: 2026ء

ناشر: ادارہٴ حیدریہ، ورجینیا (واشنگٹن)

Idara.e.Haideria,

2865. Gloucester Court,

Woodbridge Virginia. 22191, USA.

انتساب

میں اس ترجمے کو مجاہدِ ملت مولانا نعمت علی سدھو کے نام کرتا ہوں جنہوں نے کئی عشروں تک حق و صداقت کا پرچم تھامے رکھا اور ملتِ جعفریہ کو ملاوٹی عرفان اور تصوف کے خطرے سے آگاہ کیا۔ اگرچہ اس راستے میں ان کو بعض نادان لوگوں کی طرف سے بہت سی تہمتوں اور دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا کہ جن کو سہنے کا اجر خدائے متعال کے ہاں محفوظ ہے۔ انشاءاللہ

(مترجم)

فہرست

ابتدائیہ

جب انسان صوفیوں کے آثار کے اوراق پلٹتا ہے اور ان کی تحریروں پر غور و فکر و تجسس کے ساتھ نظر ڈالتا ہے تو اسے دو قسم کے مطالب ملتے ہیں:

1: ایسے مطالب جو سادہ، قابلِ مطالعہ اور بعض اوقات سود مند ہیں۔ جو مختلف مذاہب و ادیان اور مختلف مکاتبِ فکر سے مستعار لیے گئے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی نظر صرف اسلام تک محدود نہیں رہی بلکہ انہوں نے میسحیت، بدھ مت، خسروانی مذہب، زرتشتی مذہب، مانی مت، مزدکیت، فلسفۂ افلاطون، فلوطین (Plotinus) کے فلسفے اور دیگر مکاتب فکر سے چناؤ کیا اور ان کے امتزاج سے ایک مسلک، جسے تصوف کہا جاتا ہے، تخلیق کیا۔ بعض کے بقول: "پختہ اور پہنچے ہوئے صوفی معتقد ہیں کہ ہر ایک مذہب و مسلک میں حقیقت کا ایک جزو پایا جاتا ہے، چاہے وہ حقیقت بہت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک روشن ضمیر اور غیر متعصب صوفی ان حقائق کو جس جگہ اور جس گروہ کے پاس پائے ان کو اکٹھا کر لینے اور اختیار کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔"[1] یوں انہوں نے کوشش کی کہ سبھی مذاہب کی سختیوں کا مقابلہ اور مخالفت کریں۔

2: ایسے مطالب جو نادرست، نامعقول اور کھلی خرافات پر مشتمل ہیں۔ اس باب میں صوفیوں کی تحریریں بعض اوقات اتنی الجھی ہوئی اور بے ربط ہیں کہ یہ خوابِ پریشان جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں عجیب و غریب دعوے پائے جاتے ہیں، جنہیں پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر: بایزید بسطامی کا معراج نامہ، حلاج کی شطحیات، جنید بغدادی اور ابوالحسن فرقانی پر ہونے والے الہامات،[2] نیز مولوی رومی کی مثنوی میں متعدد واقعات، شیخ اعظم پر الہام ہونا،[3] اس کے علاوہ محیی الدین ابن عربی کے عجیب دعوے اور سب سے عجیب تر شیخ احمد جامی کی کرامات ہیں۔ محمد غزنوی نے کتاب مقامات ژندہ بیل میں شیخ احمد جامی کی تقریباً 400 کرامات اور غیر معمولی کام لکھے ہیں، جنہیں ہذیان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ تعلیمات قرآن و حدیث اور سیرتِ پیغمبرِ اسلام ﷺ اور سیرتِ آئمہ معصومینؑ اور ان کے اصحابؓ کے طریقۂ کار کے مطابق نہیں ہیں۔ صوفیوں کی بے راہ روی کی اہم وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام میں دخل اندازی کی۔ گویا یہ چاہا کہ اسلام کو صوفیانہ رنگ دیں اور خود اسلام کے پیرو نہ ہوں بلکہ اسلام کو اپنا پیرو بنائیں۔ اگر کوئی صرف صوفیوں کی بے راہ روی کے اسی پہلو پر لکھے تو ایک بہت بڑی کتاب بنے گی۔ اسی لیے دین کے محافظ، جو ایمان و عقیدے کے رکھوالے ہیں، صوفی ازم کی بدعت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور اپنے پیروکاروں اور شیعوں کو صوفیوں کی پیروی سے بچاتے رہے۔

---

[1] تاریخ تصوف، صفحہ 7،8۔

[2] تذکرۃ الاولیاء، جلد 1، صفحات 172 تا 176؛ جلد 2، صفحات 13،212۔

[3] نقد العلم والعلماء/310

صوفیوں کی اصلیت جاننے کے لیے یہی کافی ہے کہ رسول اکرمؐ اور آئمہ اطہارؑ سے مروی احادیث کا مطالعہ کیا جائے۔[1] صاحب وسائل الشیعہ مرحوم شیخ حر عاملی (متوفیٰ 1693ء) نے اپنی کتاب الاثنیٰ عشریہ میں صوفیوں کی مذمت میں درجنوں روایات نقل کی ہیں۔ اسی طرح تاریخ میں اہل تشیع کے بڑے علماء و فقہا، جو ایمان و عقیدے کے محافظ تھے، اس واضح بدعت کے خلاف کتابیں و رسائل لکھ کر ان کے انحرافی عقائد پر تنقید کرتے رہے۔ ان میں سے ایک مختصر مگر بہت مفید کتاب جلوۂ حق ہے، جو ہمارے استاد، بزرگ عالم و زعیم حوزہ علمیہ قم، مرجعِ عالیقدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی کے قلم سے ہے۔ اگرچہ استاد نے اسے تقریباً 40 سال قبل زمانۂ جوانی میں لکھا اور بظاہر یہ ان کا پہلا مطبوعہ کام تھا، لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت میں بہت قیمتی، مفید اور مؤثر ہے۔ حال ہی میں اس پر تجدید نظر کی گئی، متعدد اصلاحات و تبدیلیاں کی گئیں اور اس کی قدر میں اضافہ ہوا۔

یہ کتاب، جو طویل عرصے سے نایاب تھی، اب شائقین کی درخواست پر دوبارہ شائع کی جا رہی ہے۔ موجودہ طباعت میں گذشتہ طباعتوں کے مقابلے میں کچھ فوائد ہیں، جن میں سب سے اہم استاد کی جانب سے اصل کتاب پر ایک مفصل مقالے "اسلامی عرفان اور ملاوٹی عرفان" کا اضافہ ہے۔ نیز ایک مقدمے اور مقالے "اسلامی معاشرے میں تصوف کی پیدائش" اور ان حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، جو میں (داوٗد الہامی) نے اس طباعت میں شامل کئے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ صوفیوں کے افکار و عقائد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے کسی مختصر کتاب کی تلاش میں ہیں وہ اس کتاب میں اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کریں اور ان پر غور و فکر کر کے فیصلہ کریں۔ امید ہے کہ یہ ناچیز خدمت درگاہِ حضرت احدیت میں قبول ہو اور حضرت ولی عصر امامِ زمان روحی لہ الفداء کی خوشنودی کا سبب بنے۔ نیز سب، خاص طور پر نوجوان و تعلیم یافتہ نسل، کی بیداری و آگاہی میں مددگار ثابت ہو۔

انہ ولیُ التوفیق

داوٗد الہامی

حوزہ علمیہ قم، 21/4/73

[1] عرضِ مترجم: امام علی رضاؑ نے فرمایا: لا يقول احد بالتصوف إلا لخدعه أو ضلاله أو حماقه و أما من سمى نفسه صوفيا للتقيه فلا إثم عليه و علامته أن يكتفي بالتسميه فلا يقول بشيء من عقائدهم الباطله. ترجمہ: "کوئی شخص تصوف کا قائل نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ فریب، جہالت، گمراہی یا حماقت کا شکار ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی تقیہ کی بنا پر خود کو صوفی ظاہر کرتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ وہ بس نام کی حد تک صوفی ہو اور انکے کسی باطل عقیدے کا قائل نہ ہو۔" (مقدس اردبیلی، حدیقۃ الشیعہ، جلد 2، صفحہ 803۔)

امام علی نقیؑ نے فرمایا: الصوفية كلهم من مخالفينا و طريقتهم مغايرة لطريقتنا. ترجمہ: "صوفی سب کے سب ہمارے مخالف ہیں اور ان کا راستہ ہمارے راستے سے جدا ہے۔" (شیخ عباس قمی، سفینۃ البحار، ج 5، ص 199۔)

نئی طباعت کا مقدمہ

نوجوان خبردار رہیں!

تقریباً چالیس سال پہلے جب میں نے اس کتاب کا ایک حصہ لکھا، جو میری پہلی تصنیف تھی، بعض شہروں میں صوفی بہت سرگرم تھے۔ اس وقت کی حکومت نے انہیں نہ صرف آزاد چھوڑ رکھا تھا بلکہ بعض سرکاری اہلکار خانقاہوں کی تعمیر میں ملوث ہوتے تھے اور خرقہ پوشی اور درویشی کے طریقوں کو اپنائے ہوتے تھے۔ اس کی وجہ واضح تھی: وہ ایک ایسا مذہب چاہتے تھے جو اندرونی سفر پر مرکوز ہو اور باہر سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ جو سیاست میں مداخلت نہ کرے اور ایک اصول کے طور پر سیاست سے لاتعلق رہے۔ ناسوت سے بھاگ کر لاہوت اور جبروت میں پناہ لے۔ وہ دین کے ساتھ ساتھ اہلِ علم سے بھی بالکل الگ ہونا چاہیے تا کہ وہ خطرہ جو علما کے معاشرے میں مرکزی کردار سے وہ محسوس کرتے تھے، اس کا سامنا نہ ہو اور وہ ڈراؤنا خواب رونما نہ ہو جس نے آخر کار انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ وقت اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ گزر گیا۔ تاہم آج پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بیرون ملک اور اندرون ملک تصوف کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کچھ اداروں میں بعض استاد بھی تصوف کو تقویت دے رہے ہیں۔

اس کی دو وجوہات ہیں: پہلی، وہ گروہ جو اہل علم کی حکمرانی کی مخالفت کرتا ہے لیکن مذہب اور عقیدے کے اصولوں کی مخالفت کرنا ناممکن سمجھتا ہے، وہ تصوف کی طرف رجوع کرتا ہے، جس میں مذہب کا رنگ و روپ بھی ہے اور وہ اہل علم اور مذہب کے بالکل مدمقابل بھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا مذہب چاہتے ہیں جو سب سے بنا کر رکھے، نجات کو صرف دل کی پاکیزگی میں سمجھے اور بس۔ وہ اسلامی فرائض کی ادائیگی میں سختی نہ کرے اور بہت سے کاموں کے ارتکاب کا راستہ کھلا چھوڑ دے۔ وہ چھلکا ہیں، مغز نہیں!

یہ سب تصوف میں مل جا سکتا ہے، ایسی چیز جس سے اسلام کی خوشبو آتی ہے، لیکن وہ اسلام نہیں ہے اور اسلام پر حملہ کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر، جس میں بڑے پیمانے پر نظر ثانی کی گئی ہے اور اس میں بہت سے مواد کا اضافہ کیا گیا ہے، آپ کو اس "خطرے کے مرکز" کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ عوامی بیداری نے اس خطرے کو بہت حد تک کمزور کر دیا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو صوفیاء کے عجیب و غریب حالات، افکار اور عقائد ملیں گے جن پر یقین کرنا آپ کے لیے مشکل ہو سکتا ہے، لیکن مسئلہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اور ہم نے اختصار کی خاطر ہر ایک کا ذکر نہیں کیا ہے۔

یہاں دو نکات کا ذکر ضروری ہے:

1: بعض لوگوں نے نادانی سے یا جان بوجھ کر ایک چال کا سہارا لیا ہے اور امام خمینی کے بعض اشعار اور ان کے بعض عرفانی خیالات کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ عظیم شخصیت ایک اسلامی عارف تھی اور ان کے افکار صوفیوں کے افکار سے کوسوں دور تھے۔ وہ امیر المومنین علیؑ کی تعلیم کردہ دعاؤں، امام حسینؑ کی دعائے عرفہ، صحیفہ سجادیہ اور آئمہ اطہار ؑ کی مناجاتِ شعبانیہ سے سیر ہو کر قرآن کی آیات کا جامِ کوثر پی چکے

تھے۔ لیکن من پسند عرفان میں مبتلا لوگ تو ہندو جوگیوں اور راہبوں کی رہبانیت کی نجاست بھی کھا لیتے ہیں۔[1] امام خمینی تصوف میں گوناگوں جتھے بنانے کی صلاحیت کے خطرے سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان لوگوں سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ پر شکوہ اسلامی انقلاب کے بعد بہت سی خانقاہیں، جو ان گروہوں کا مرکز تھیں، استعماری مراکز قرار دے کر بند کی گئیں۔ ان کے دورِ حکومت میں صوفیوں کی تخریب کاریوں پر پابندیاں لگیں۔ اللہ ان کو اس کام کا بہترین اجر دے۔ اگر کبھی کبھار انہوں نے تصوف کے بعض مشائخ کا ذکر کیا تو ان کے مدِ نظر اس کا کوئی ایک پہلو ہوتا تھا، نہ کہ سبھی ابعاد!

آپ اس کتاب میں کچھ چیزیں پڑھیں گے جو تصوف اور صوفیت کی جڑوں کے بارے میں ہیں۔ یہ چیزیں تصوف کی طرف مائل ہر شخص پر صادق نہیں آتی ہیں۔ بسا اوقات پختہ ایمان والے خالص نوجوان دھوکہ کھا کر ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور ان کی غلطی بس اتنی ہوتی ہے کہ انہوں ظاہر کو دیکھا اور باطن کو نظر انداز کر دیا۔ ہم ان کی زیادہ سرزنش نہیں کرتے، بلکہ ان کی نجات کے لیے دعا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جب بھی اس کتاب کو کسی تعصب کے بغیر پڑھیں گے تو بدل جائیں گے۔

اے اللہ ہمیں سیدھے راستے پر چلا!

ناصر مکارم شیرازی

مرداد ماہ 1373

[1] عرض مترجم: ممکن ہے وہ لوگ جو امام خمینی کو تصوف کا امام سمجھتے ہیں، علامہ کی اس بات کو تقیہ قرار دینا چاہیں، کیوں کہ علامہ موصوف ایران میں رہتے ہیں۔ لیکن اگر امام خمینی کے آثار پر غور کیا جائے تو علامہ کی بات کی تائید میں کئی شواہد ملتے ہیں۔ امام خمینی اپنی بہو محترمہ فاطمہ طباطبائی کے نام خط میں لکھتے ہیں: "اسفارِ اربعہ نے اپنے طول و عرض کے ساتھ مجھے دوست کی طرف سفر سے روکے رکھا۔ نہ فتوحاتِ مکیہ سے مجھے کوئی فتح حاصل ہوئی نہ فصوص الحکم سے کوئی حکمت ہاتھ آئی۔" (صحیفۂ امام، جلد 20، صفحہ 165۔) صوفیوں کی اکڑ اور احساسِ برتری کے بارے میں لکھتے ہیں: "عرفاء و صوفی اور اہلِ سلوک و ریاضت، جو ارشاد و ہدایت کے مدعی ہوتے ہیں، وہی عُجب کے اس درجہ سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔" (شرح چہل حدیث، تیسری حدیث، صفحہ 95۔)

ہماری روش

ان کتابوں میں جو دور افتادہ افراد اور منحرف فرقوں کے جوابات کے طور پر تحریر کی جاتی ہیں، ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اکثر مصنفین مذہبی جذبات کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور علمی و منطقی بحث کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں، اور خشک و غیر علمی تعصبات کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ اس لیے بعض کتابوں میں راہنمائی و ہدایت کے بجائے انتقام و کینے کا عنصر زیادہ غالب ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے ان کے اثرات گہرے نہیں ہوتے، اور بدقسمتی سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں کا ایک قابلِ ذکر حصہ اس کمزوری سے پاک نہیں ہوتا۔ اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ بعض مصنفین ادب کی حد سے باہر نکل گئے اور انہوں نے بری تعبیرات و ناشائستہ الفاظ استعمال کیے۔ واضح ہے کہ یہ طرزِ تحریر نہ صرف گمراہوں کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ ان کے منفی احساسات کو بھی ابھارتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے غصے کو ابھار کے انہیں سخت گیر بھی بنا دے!

چنانچہ ضروری ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین تمام ناجائز حملوں اور مخالفین کی بدگوئی کو (ان کی ہدایت کے لیے) برداشت کریں اور تعصب اور غصے کے بغیر دلسوزی اور حسن نیت کے ساتھ مخالفین کے نقائص اور غلطیوں کی تشریح کریں۔ مزید بر آں، ان کتابوں کے مصنفین کو چاہیے کہ کوئی بھی بات ایسے حوالوں کے بغیر بیان نہ کریں جو غیر جانبدار افراد کے لیے قابلِ اعتماد ہوں۔ اپنے مخالفین کے عقائد کو ممکن حد تک ان کی اپنی کتابوں سے نقل کریں۔ اس کے علاوہ کبھی بھی صرف اکیلے قضاوت نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیشہ یہ تصور کرنا چاہیے کہ کچھ سخت مخالف آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کی تحریروں کی نگرانی اور ان پر تنقید کر رہے ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات عناد رکھنے والوں کے مقابلے میں سخت اور کوبندہ بحثیں ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں، مگر یہ معاملہ استثنائی ہوتا ہے۔ اگر ان تمام نکات پر اس قسم کی تحریروں میں عمل کیا جائے تو یقیناً یہ زیادہ مؤثر ثابت ہوں گی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ یہ کتاب جو صوفیوں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہے، اسی روش پر لکھی جائے۔ امید ہے کہ اس کام میں کامیابی حاصل ہو۔

یہ کتاب پہلی بار تقریباً 40 سال قبل شائع ہوئی تھی، اور اب کثیر اصلاحات و تجدید نظر کے ساتھ دوبارہ شائع کی جا رہی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف صوفیوں کے مختلف راستوں کی پہچان کے لیے ایک اچھی رہنما ہے بلکہ ان افراد کے لیے بھی قابل قدر معلومات فراہم کرتی ہے جو مختصر مطالعے کے ذریعے ان کے عقائد اور فکری اصولوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

باب اول: اسلامی عرفان اور ملاوٹی عرفان

بات عرفان سے شروع کرتے ہیں: عرفان کی روح اللہ کی معرفت کیلئے ایک کوشش اور جستجو ہے، جو اپنے آپ میں سفر، باطنی مشاہدے، اور معنوی و روحانی جلووں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اور اس میں تہذیبِ نفس، زہد اور اخلاقی اقدار کو اپنانے کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ چاہتا رہا ہے کہ استدلال، یعنی فلسفہ اور کلام، کے علاوہ بھی کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے جو اسے اللہ کی معرفت کی طرف لے جائے، اور وہ اس مختصر اور قابل اطمینان راستے سے اپنے معبود و معشوق حقیقی کے قریب ہو جائے۔ اس کے جمال و جلال کو دیکھے، اس کی صفات میں غرق ہو جائے، اس سے دل لگا کر محبت کرے، اور جو کچھ اس کے سوا ہے اسے اس کے سامنے قربان کردے۔ یہ حقیقت تقریباً سبھی انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں موجود ہے، تاہم بعض میں یہ بہت کم رنگ اور تقریباً فراموش شدہ ہوتی ہے، اور بعض میں بہت زیادہ روشن، گرم اور آتشین۔ لیکن انسان ہمیشہ اس راستے پر صحیح طریقہ اختیار نہیں کرتا، بعض اوقات لوگ اتنے بھٹک جاتے ہیں کہ مختلف شیاطین کے جال میں پھنس کر صحیح مقصد کے برخلاف چل پڑتے ہیں۔ اس بڑے مقصد تک پہنچنے کے لیے تین راستے ہیں:

1: وحی کا راستہ، وہ راستہ جو انبیاء و پیغمبرانِ الٰہی اور ان کے خلفائے معصومؑ نے پیش کیا؛ وہ راستہ جس کے رہبر، رہنما اور مرشد وہ ہوتے تھے۔

2: غیر معصومین کا راستہ، یعنی اربابِ ریاضت اور اشراقی فلاسفہ جیسے بعض افراد کا راستہ، جو وحی کی روشنی سے فائدہ اٹھائے بنا اس خطرناک سفر پر نکلے، اور خضرِ راہ کے ہمراہ نہ رہنے کے سبب راستے سے بھٹک کر اندھیروں میں گم ہو گئے۔ وہ بعض اوقات یہ سمجھتے رہے کہ وہ مقصد پر پہنچ گئے ہیں اور اپنی کامیابی پر اتنے مست ہوئے کہ کہنے لگے:

آن را کہ پیر دیر بہ ماہی کند تمام   در سی ہزار سال ارسطو نمی کند

ترجمہ: "جو کچھ دیر کا پیر ایک مہینے میں سکھا دیتا ہے وہ ارسطو کا ہزار سالہ درس بھی نہیں سکھا سکتا۔"

3: تصوف کا راستہ، جو ایک ملاوٹی راستہ ہے کہ جس میں کچھ انبیاءؑ کی تعلیمات سے لیا گیا اور کچھ اربابِ ریاضت سے لیا گیا، اور ہر گروہ نے اپنے ذوق و ذاتی پسند کے مطابق اضافے اور تصرفات کر کے بہت سے فرقے بنا دیئے، جن کی تعداد حد و حساب سے بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم مختصر و جامع طور پر اس ملاوٹی عرفان کا جائزہ لیں، اور ان کے اختیار کردہ راستے پر جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان پر روشنی ڈالیں۔

1۔ تصوف کا ماضی اور حال

ایسے رجحانات کہ جن سے ہر علاقے میں کچھ نہ کچھ لوگ متاثر ہو جاتے ہیں، میں سے ایک تصوف یا اس سے ملتے جلتے رجحانات بھی ہیں۔ یہ ہر جگہ ایک اقلیت کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اگرچہ ممکن ہے ہر جگہ یہ رجحانات اس نام سے نہ پائے جاتے ہوں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ خاص رجحان اسلام سے پہلے بھی یونان، ہند، اور یورپ و ایشیا کے مختلف ممالک میں موجود تھا۔ یونانِ قدیم میں کلبیوں کا طریقۂ زندگی ایک قسم کا صوفیانہ طریقہ تھا۔ ہندو جوگیوں اور مسیحی راہبوں کے رجحانات میں بھی تصوف کا رنگ و بو موجود تھا۔ اسلام کی پہلی صدی میں اسلامی ماحول کے اندر صوفیانہ رجحانات کا کوئی

واضح اثر نہیں دکھائی دیتا، لیکن دوسری صدی سے جب اسلام دور دراز تک پھیل گیا اور ساتھ ہی دیگر اقوام کے علوم اور ان کے تمدن کے آثار کا عربی ترجمہ اسلامی ماحول میں پہنچا، تو اپنے مخصوص رجحانات رکھنے والے مترجمین نے تصوف کو اسلامی ماحول تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اصولی طور پر دوسری صدی ہجری اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں جب بنی عباس دوسری اقوام کے علوم کی نشر واشاعت اور عربی میں ان کے تراجم کروانے میں کوشاں تھے، مختلف مذاہب و فرقوں کا بازار گرم ہو گیا اور تصوف کا مسلک بھی آہستہ آہستہ مسلمانوں میں رواج پانے لگا۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے اس مسلک کے بیج کو اسلامی سرزمین میں بکھیر دیا وہ ابوہاشم کوفی تھا،[1] اور بعض روایات میں اس کے بارے میں آیا ہے:ہو الذي ابتدع مذہباً يقال له التصوف و جعله مقرّاً لعقيدته[2]، ترجمہ:"وہی وہ شخص ہے جس نے تصوف نام کا مذہب ایجاد کیا اور اسے اپنے عقیدے کا مرکز بنایا۔"

اس بات کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ صوفیوں کی مذمت اور ان کے طریقوں پر تنقید کی روایات عموماً امام صادقؑ اور ان کے بعد کے آئمہ سے مروی ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں ایسی روایات کی ایک بڑی تعداد کو جمع کیا ہے۔[3] مورخین کہتے ہیں کہ مذکورہ زمانے سے پہلے مسلمانوں میں تصوف یا صوفی ازم کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ اگر کبھی اس دور سے پہلے کی کسی روایت میں صوفی کا لفظ مل جائے، تو یہ قرن اول میں اس مسلک کی موجودگی کی دلیل نہیں ہے، کیونکہ عرب اس لفظ کو صرف پشمینہ پوش شخص کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر حسن بصری سے روایت ہے کہ اس نے کہا:رأيت صوفياً في الطواف و اعطيته شيئاً فلم يأخذ، ترجمہ:"میں نے طواف میں ایک پشمینہ پوش دیکھا، اسے کچھ دیا مگر اس نے قبول نہ کیا۔" واضح ہے کہ صوفی سے اس کی مراد ایک پشمینہ پوش فقیر تھا، کہ جس کی وہ کچھ مدد کرنا چاہتا تھا۔

بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ صوفی کا لفظ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے دور میں بھی رائج تھا اور زہاد و عباد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ شاید اس دعوے کی واحد دلیل وہ روایت ہے جو کتاب عوالی اللئالی میں مذکور ہے، جس میں امام علیؑ سے مروی ہے کہ" لفظ صوفی تین حروف پر مشتمل ہے (ص،و،ف): حرف صاد تین بنیادوں پر ہے: صدق، صبر، صفا؛ حرف واو بھی تین بنیادوں پر ہے: ود، ورد، وفا؛ حرف فا بھی تین بنیادوں پر ہے: فرد، فقر، فنا۔ جس میں یہ خصوصیات موجود ہوں، وہ صوفی کہلائے۔ ورنہ کوفے کا ایک کتا بھی ہزار صوفیوں سے بہتر ہے۔"تاہم ہم جانتے ہیں کہ کتاب عوالی اللئالی معتبر نہیں اور اس کے مصنف پر کئی پہلوؤں سے تنقید کی گئی ہے کہ اس نے صحیح اور ضعیف احادیث کو ملا دیا ہے۔

بہر حال، جیسا پہلے بھی ذکر ہوا، تصوف نے بہت سے گروہ جنم دیئے اور جب کسی قطب کا انتقال ہوتا یا کسی سلسلے کا پیر فوت ہوتا، تو کئی افراد خود کو اس کا خلیفہ کہتے اور ایک سلسلے سے کئی سلسلے پیدا ہوتے۔ آج مصر، عراق، شام، ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں متعدد صوفی فرقے موجود ہیں جو

---

[1] جاحظ، البیان والتبیین، جلد1، صفحہ 232، طبع مصر۔

[2] سفینۃ البحار، جلد2، صفحہ 57۔

[3] بحار الانوار کی جلد11، 15اور 17 سے رجوع فرمائیں۔ مرحوم محدث قمی نے ان میں سے اکثر احادیث کو سفینۃ البحار کی دوسری جلد میں مادہ"صوف"کے ذیل میں درج کیا ہے۔

ایک دوسرے سے تصادم، مقابلہ بازی اور لڑائی میں مشغول ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ تصوف سنیوں میں زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ تقریباً تمام مشہور صوفی مشائخ جیسے بایزید بسطامی، جنید بغدادی، شیخ عطار وغیرہ سب اہل سنت سے ہیں، حتیٰ کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ شیعوں میں جو صوفی مشائخ ہوئے ہیں ان کا سرا بھی اہل سنت کے کسی نہ کسی شیخ سے جا ملتا ہے۔ ان کے سلسلوں میں گروہ بندیاں زیادہ ہونے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ ان میں قطب، پیر، مرشد یا دلیلِ راہ کے لیے کوئی واضح معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ہاں ایک معیار مکاشفہ ہے اور وہ خواب کو ایک قسم کا مکاشفہ سمجھتے ہیں اور اپنے قطب یا مرشد کے چناؤ کیلئے خوابوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خواب میں مرشد کے بارے میں رہنمائی ملنی چاہئے۔ واضح ہے کہ اس معیار کا نتیجہ کیسا ہو گا۔ پہلی صدی ہجری میں اسلامی معاشرے کے پھیلاؤ کی وجہ سے زہد کی طرف لوگوں کے رجحان میں اضافہ ہوا، اور اس دور میں اسلام کے معروف زہاد ظاہر ہوئے، لیکن اس رجحان میں تصوف کا کوئی اثر نہ تھا۔ (دقت کیجئے!)

تاریخِ تصوف کے مؤلف کے مطابق: "اس عہد کے زہاد و نساک کے آثار میں صرف زہد کا وہ رجحان نظر آتا ہے جو بنی امیہ کے ظلم و فساد کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ان میں بعد کی صدیوں میں سامنے آنے والی صوفیانہ فکر کے مرکزی مفاہیم جیسے عشق و محبت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ نہ نظریۂ وحدتِ وجود، نہ فناوبقاء کی باتیں، نہ صحو و سکر یا قبض و بسط، نہ وقت، حال، وجد، جمع و تفرقہ، ذوق، محو، اثبات، تجلی، محاضرہ، مکاشفہ، لوائح، طوالع اور تمکین وغیرہ۔ ابوالفرج بن الجوزی کہتا ہے کہ صوفی کا نام 200 ہجری سے کچھ پہلے استعمال ہونا شروع ہوا۔"[1] جنید بغدادی کہتا ہے: "تصوف یعنی بری خلق و خو سے نکلنا اور ہر نیک خلق میں داخل ہونا"... ہاں! شروع میں یہ لوگ ایسے تھے، بعد میں ابلیس نے انہیں فریب دیا، روز نئے دھوکے کا شکار کیا اور ہر آنے والی صدی میں اس کے دھوکے بڑھتے چلے گئے۔ اصل فریب یہ تھا کہ صوفیوں کو علم سے روک دیا اور انہیں کہا مقصد صرف عمل ہے۔ جب علم کا چراغ بجھ گیا، جہالت کا اندھیرا غالب آیا تو یہ متعدد غلطیوں کا شکار ہوئے۔[2]

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صوفی صوف سے نکلا ہے کیونکہ ابتدائی زمانے میں یہ لوگ پشمینہ پوش تھے۔ بعض انہیں قبیلہ بنی صوفہ سے نسبت دیتے ہیں جو عربوں کا ایک قبیلہ تھا اور زاہدانہ زندگی گزارتا تھا اور اس وجہ سے صوفیوں کو ان سے جوڑا جاتا ہے۔[3] بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اسے لفظ صفا سے مشتق سمجھیں، لیکن لغوی طور پر یہ درست نہیں۔ صوفی اجوف ہے اور صفا ناقص واوی ہے۔ اگر یہ صفا سے نکلا ہوتا تو صفائی ہوتا، صوفی نہیں۔ بعض لوگ صوفی کو اصحابِ صفہ سے ملانا چاہتے ہیں، جو مہاجرین میں سے کچھ غریب، فقیر اور زاہد لوگ تھے۔ یہ رسول اللہؐ کے ایسے صحابہؓ تھے جن کے پاس اپنا گھر نہیں تھا اور یہ مسجد نبوی کے پاس ایک چبوترے (صفہ) پر رہتے تھے۔ یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کیونکہ صفہ صف سے ہے جبکہ صوفی صوف سے ہے اور ان دو الفاظ میں کوئی جوڑ نہیں بنتا۔

بعض تصوف زدہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تاریخ کو آغاز اسلام تک پہنچائیں۔ یوں یہ خرقہ علی علیہ السلام کو پکڑلیں اور سلمان، ابوذر اور مقداد رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے مشائخ میں شمار کریں۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہوا، تاریخِ اسلام میں اس کی کوئی گواہی موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس بات

---

[1] تاریخ تصوف، صفحہ 23۔

[2] تلبیسِ ابلیس، صفحہ 173۔

[3] تلبیسِ ابلیس، صفحہ 173۔

کی تائید میں کئی حوالے مل جاتے ہیں کہ تصوف دوسری صدی ہجری میں اسلامی معاشرے کے باہر سے آیا۔ ہندوستان، یونان اور مسیحی علاقوں سے یہ اسلامی سرحدوں میں داخل ہوا اور اسلامی عقائد سے مخلوط ہو کر ایک ملاوٹی فرقہ بن گیا۔

تاریخِ تصوف میں اتار چڑھاؤ واضح ہے۔ ماضی اور حال کے بعض اہل سیاست اس بات کو ترجیح دیتے تھے اور دے رہے ہیں کہ مذہب تصوف کی شکل میں پیش ہو۔ اس کے خاص اسباب ہیں جن کی طرف خدا نے چاہا تو آگے چل کر اشارہ کیا جائے گا۔ لہٰذا کبھی اہم سیاسی شخصیات کی مدد سے اور کبھی خود سلطان کی حمایت سے بعض مناطق میں تصوف بہت پھیل گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ خانقاہیں تعمیر ہوئیں اور صوفیوں کے اقطاب اور مشائخ کی دکانیں چمک اٹھیں۔ سماجی عوامل نے بھی اس اتار چڑھاؤ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان چیزوں کی تفصیل کو تصوف کی تاریخ پر لکھی گئی کتابوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

2۔ ملاوٹ سے پیدا ہونے والے اندرونی تضادات

ہر ملاوٹی مکتب ناگزیر طور پر مختلف تضادات کا شکار ہوتا ہے۔ اصطلاحاً یہ تضاد ایسے قضایا میں شمار ہوتا ہے کہ قیاساتہامعہا، یعنی اس کی دلیل اس کے اندر ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ ملاوٹ کی طبیعت ہی یہ ہے کہ مختلف اور غیر ہم جنس ماخذوں سے اصول لیے جائیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کمیونزم (جو مادیت پر مبنی ہے) کو اسلام (جو خدا پرستی پر مبنی ہے) کے ساتھ ملا کر، گویا ایک قسم کا "اسلامی کمیونزم" پیدا کرنا چاہے، تو وہ ناگزیر طور پر تضادات کا شکار ہو گا، کیونکہ مادیت خدا پرستی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم وہ تضادات گنیں جن میں تصوف مبتلا ہو چکا ہے، تو بات طویل ہو جائے گی اور اس کے لیے ایک مفصل کتاب کی ضرورت ہو گی۔ یہاں اس معاملے کے صرف چند بنیادی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں:

1: عقلی استدلالات کا ترک کرنا

یہ لوگ عقلی استدلالات کو ترک کرتے اور اس قسم کے بہانے بنا کر تعلیمی اداروں، درس اور مباحثے سے دور بھاگتے ہیں کہ تعلیمی اداروں کے قیل و قال سے کچھ نہیں ملتا۔

بشوی اوراق ہم اگر ہمدرس مائی   که درس عشق در دفتر نباشد

یہ لوگ علم، استدلال، کلاس، مباحثے، کاپی اور پین کی مخالفت میں اتنے انتہا پسند بن گئے کہ ان میں سے بعض نے پڑھنے، لکھنے، کتابوں اور علم کے سبھی مظاہر سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ان کے بڑوں کی عجیب و غریب باتوں کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

الف: تصوف کا ایک مشہور شیخ جنید بغدادی معتقد تھا کہ پڑھنا اور لکھنا صوفی کے ذہن کو پراکندہ کر دیتا ہے۔

ب: بشر حافی کے حالات میں شیخ عطار لکھتا ہے کہ اس کے پاس احادیث کی کتابوں کے سات صندوق تھے اور اس نے ان سب کو مٹی میں دفن کر دیا۔

ج: شبلی کہتا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو جانتا ہے جو تب تک صوفی نہ بنا جب تک اس نے اپنی تمام دولت چندے میں دے دی اور کتابوں کے ستر صندوق دریائے دجلہ میں بہا دیئے۔ ان کو اس نے خود لکھا اور یاد کیا تھا اور کئی روایتوں کی اس نے تصحیح بھی کی تھی۔

د:ایک پیرِ طریقت احمد بن ابی الخواری نے بھی اپنی کتابیں دریا برد کر دیں اور کہا:نعم الدلیل کنت و لکن الاشتغال بالدلیل بعد الوصول محال، ترجمہ:"تم میری بہترین رہنما تھیں لیکن وصولِ حق کے بعد رہنماؤں میں مشغول رہنانا ممکن ہے۔"اگرچہ کتاب"تاریخِ تصوف"میں اس بات کو ابن ابی الخواری سے منسوب کیا گیا ہے لیکن ایسی ہی بات کو بعض دوسرے لوگوں نے ابو سعید ابوالخیر سے بھی نقل کیا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی کتابیں مٹی میں دفن کر کے کہا:نعم الدلیل...

ہ:ابو سعید نے یہ بھی کہا:راس ہذا الامر کبس المحابر و خرق الدفاتر و نسیان العلم، ترجمہ:"اس پروگرام کا آغاز ہی دواتیں پھینکنے، کاپیاں پھاڑنے اور علم کو بھول جانے سے ہوتا ہے۔"

ز :ابو سعید سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ:"جب خاص حالت طاری ہو گئی تو اپنی کتابوں اور کاپیوں سے مجھے چین نہیں ملتا تھا۔ میں نے خدا سے دعا کی کہ مجھے ذہنی سکون عطا کرے۔ خدا نے مجھ پر فضل کیا اور میں نے اپنی کتابوں کو دور کیا اور قرآن کی تلاوت شروع کی۔ سورہ فاتحہ سے سورہ انعام تک پڑھتا گیا اور اس آیت پر پہنچا قل اللہ ثم ذرہم، یہاں کتاب کو چھوڑ دیا اور جتنی بھی کوشش کر لی کہ ایک آیت اور پڑھوں، چل نہ سکا اور اسے بھی ایک کونے میں رکھ دیا۔"

اوپر جو کچھ پیش کیا گیا ہے اسے ایک مرتبہ پھر پڑھیں اور دیکھیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ ایسی تعلیمات اسلام کے متن سے نکلی ہوں؟ کیا قرآن، جو کہ ہر خیر کی طرف رہنمائی کرنے والا نورِ مبین ہے اور امیر المؤمنینؑ کے الفاظ میں دلوں کی بہار، دانش کا سرچشمہ اور دلوں کو جلا بخشنے والا ہے، اسے سیر و سلوک کے مراحل میں ایک طرف رکھ دیا جائے؟ یہ ایسے حال میں کہا جارہا ہے جب معروف حدیثِ ثقلین کہتی ہے کہ سب مشکلات کے حل کیلئے قرآن اور اہلبیتؑ کی پناہ حاصل کی جائے۔ کیا قرآن اور علم، جو کہ خدا کو پہچاننے کا راستہ ہے اور صحیح راستے کا رہنما ہے، اس سے دوری اختیار کی جا سکتی ہے اور اسے سیر و سلوک الی اللہ میں مانع سمجھا جا سکتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک معروف روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:من حفظ علی امتی اربعین حدیثا ینتفعون بھا فی امر دینھم بعثہ اللّٰہ یوم القیامۃ فقیھاً عالما، ترجمہ : "جس کسی نے میری امت کیلئے چالیس ایسی حدیثیں محفوظ کیں جو دین کے بارے میں ان کی سمجھ بوجھ کیلئے مفید ہوں، اسے اللہ قیامت کے دن فقیہ اور عالم کے طور پر اٹھائے گا۔"

اس روایت کے مطابق جو کوئی دین کے فائدے کیلئے چالیس احادیث کو محفوظ کرے، چاہے کتاب کی صورت میں یا نقل کر کے یا ذاتی حافظے میں، اور انہیں مسلمانوں تک پہنچائے، وہ قیامت کے دن فقہاء اور علماء کی صف میں ہو گا۔ اسی وجہ سے کئی بڑے علماء نے اس معروف حدیثِ نبوی پر عمل کیلئے چہل حدیث کے عنوان سے کتب لکھی ہیں۔ اس قسم کی تعلیمات کہاں اور کہاں یہ تعلیمات کہ حدیث کی کتابوں اور دوسری کتابوں کو دریا برد کر دیا جائے یا مٹی میں دفن کر دیا جائے۔ یہ چیزیں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ یہ تعلیمات باہر سے آئی ہیں اور اسلامی تعلیمات سے جدا ہیں۔ اس نکتے کی مزید تشریح اگلے صفحات میں آئے گی۔

ح :جامی نفحات الانس میں عین الزمان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ شیخ فضل الدین کے خلفاء میں سے تھا اور بہت عالم و فاضل شخص تھا۔ جب اس نے شیخ سے ملاقات کا فیصلہ کیا تو کتاب خانے میں گیا اور لطائف علوم عقلی و نقلی سے ایک مجموعے کا انتخاب کیا تا کہ سفر کے دوران

اس کا دل لگا رہے۔ وہ کہتا ہے: جب میں خوارزم کے نزدیک پہنچا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ شیخ کہہ رہا ہے، اے گیلانی! بوجھ اتار دو اور آجاؤ۔ بیدار ہوا تو سوچا کہ یہ کس بوجھ کی بات ہو رہی تھی؟ میں کوئی دنیاوی چیز ساتھ نہیں لایا، حتیٰ اس طرف میرا دھیان بھی نہیں گیا۔ دوسری رات پھر یہی خواب دیکھا۔ تیسری رات شیخ سے پوچھا کہ بوجھ کیا ہے؟ کہا کہ وہ (علم و دانش کا) مجموعہ جو تم نے اکٹھا کیا ہے۔ جب میں بیدار ہوا تو اس کو دریائے جیھون میں غرق کر دیا۔ جب شیخ کی خدمت میں پہنچا تو اس نے کہا کہ اگر اس بوجھ کو نہ اتارتے تو تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔

یہ طرزِ فکر اور اس قسم کی تعلیمات کا کتابوں کی حفاظت اور اسلامی معارف کو اگلی نسلوں تک پہنچانے پر مبنی اسلامی تعلیمات سے مقابلہ کیا جانا چاہیے تا کہ ان دو کے درمیان فرق واضح ہو۔ مرحوم شیخ حر عاملی وسائل الشیعہ کی اٹھارہویں جلد میں امام جعفر صادقؑ سے ایک معروف حدیث نقل کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے اصحاب سے کہا:احفظوا بكتبكم فانكم سوف تحتاجون اليها، ترجمہ:"اپنی کتابوں کو محفوظ رکھو کیونکہ تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔" ایک اور روایت میں انہی امامؑ نے مفضل ابن عمر کو حکم دیا:اكتب و بث علمك فی اخوانك فان مت فاورث كتبك بينك فانه ياتی علی الناس زمان حرج لا يانسون الا بكتبهم، ترجمہ:"علم کو لکھو اور اپنے بھائیوں تک پہنچاؤ، اور جب موت قریب آئے تو اپنی کتابیں ورثا کو دے دو، کیونکہ لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ کتاب کے سوا ان کا کوئی مونس و غمخوار نہ ہو گا۔" یہ معجزانہ قول اور اس قسم کی دیگر احادیث اسلام اور آئمہ اطہارؑ کے ورثے کی حفاظت کی اہمیت کو بڑی اچھی طرح روشن کرتی ہیں۔ یہ اقوال ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ان چیزوں کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے اور انہیں مسلمانوں کی آنے والی نسلوں تک پہنچایا جائے کیونکہ ایک ایسا دور آئے گا جب مسلمانوں کی واحد پناہ گاہ ان کی کتابیں ہونگی۔

خلاصہ اور نتیجہ گیری

اس طرح، ملاوٹی عرفان یعنی تصوف کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ علم و دانش، کتاب اور تفکر کے خلاف شدید دشمنی رکھتا اور ان سے جنگ کرتا ہے، جبکہ اسلامی عرفان کے تمام مراحل میں علم و دانش کی حمایت اور پشتیبانی پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن خشیت (اللہ کا خوف) کو، جو عرفان کے اہم ترین مراحل میں سے ہے، صرف علماء اور اہل علم میں منحصر سمجھتا ہے:إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ.[1]، ترجمہ:"بے شک اللہ کے بندوں میں سے علم والے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔" اور زمین و آسمان میں اللہ کی عظمت کے مظاہر دیکھنے کی صلاحیت اولوا الالباب یعنی عقل مندوں اور دانشوروں سے مخصوص ہے۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَ مَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَ مَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ.[2]، ترجمہ" :وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت دی جائے گویا اسے خیر کثیر دیا گیا ہے اور صاحبان عقل ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔"

امیر المؤمنین علیؑ کی ایک مشہور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ اللہ کی معرفت علم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اور اطاعت و بندگی بھی اسی علم کے ذریعے ممکن ہے۔ دلوں کی زندگی علم سے ہے اور بصیرت کا نور علم کی پیداوار ہے:ان العلم حياة القلوب من الجهل و نور

---

[1] سورہ فاطر، آیت 28۔

[2] سورہ البقرہ، آیت 269۔

الابصار من العمی... و بالعلم یطاع اللّٰہ و یعبد و بالعلم یعرف اللّٰہ و یوحد.[1]، ترجمہ" :علم دلوں کو جہالت سے نکال کر زندگی بخشتا ہے اور نظروں کو اندھے پن سے نجات دے کر نورانی بناتا ہے۔ علم سے ہی اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور علم سے ہی اللہ کی معرفت اور اس کی وحدانیت کی سمجھ بوجھ حاصل ہوتی ہے۔"اصولاً صحیح عرفان کا راستہ صرف علم و آگاہی ہے،اور یہی وجہ ہے کہ علم کی طلب کو ایک عظیم الٰہی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے،جیسا کہ یہ حدیث طلب العلم فریضة،حصول علم فریضہ ہے،اس کی شاہد ہے۔[2] دین کا کمال طلب علم کو قرار دیا گیا ہے۔امیر المؤمنین علیؑ نے کہا:اعلموا ان کمال الدین طلب العلم و العمل به.[3]، ترجمہ:"جان لو کہ دین کا کمال علم کی طلب اور اس کے مطابق زندگی گزارنے میں ہے۔"

جو لوگ علم کو سلوک الی اللہ کے راستے میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور کتاب، کاپی، قلم و دوات کو ممنوع قرار دیتے ہیں،وہ امام صادقؑ کی اس حدیث کا واضح مصداق ہیں:العامل علی غیر بصیرة کالسائر علی غیر الطبق لا یزیده سرعة السیر الابعدا.[4]،ترجمہ:"بغیر آگاہی کے عمل کرنے والا،ایسے مسافر کی مانند ہے جو غلط راستے پر چل رہا ہو؛وہ جتنا تیز چلے گا اتنا ہی اصل منزل سے دور ہو گا۔"پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: من عمل علی غیر علم کان ما یفد اکثر مما یصلح.[5]، ترجمہ:"جس نے علم کے بغیر عمل کیا وہ تعمیر سے زیادہ تخریب کرے گا۔"

2:ملاوٹی عرفان شریعت کی حدود کو توڑتا ہے

اسلامی عرفان میں قرآن و سنت سے حاصل شدہ احکام مکمل احترام کے حامل ہیں،دوسرے لفظوں میں شریعت کے اصول و احکام کی پابندی سیر و سلوک کی پہلی شرط ہے۔ طریقت کا سالک کبھی بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے شریعت کی کمترین خلاف ورزی نہیں کرتا۔لیکن ملاوٹی عرفان (تصوف) میں یہ نہ صرف جائز سمجھا گیا بلکہ بعض اوقات اس کی ترغیب بھی دی گئی اور اسے ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا گیا۔اس کے واضح نمونے کتاب احیاء العلوم میں صوفیت اور عرفان کے بزرگوں کے حوالے سے ملتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اہل سنت کے بعض علماء جیسے ابوالفرج ابن الجوزی حنبلی،جو مرحوم محدث قمی کے بقول تفسیر،حدیث،وعظ اور دیگر اسلامی فنون میں ید طولیٰ رکھتا تھا،نے اس پر تنقید کی۔اس نے ایک کتاب بعنوان اعلام الاحیاء باغلاط الاحیاء لکھی اور اس قسم کے بعض مغالطوں کا رد کیا۔ایک اور کتاب تلبیس ابلیس میں کتاب احیاء العلوم کے بعض حصوں کو حوالے کے ساتھ نقل کر کے اس پر شدید گرفت کی۔[6]اس کتاب سے کچھ حصے یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔ابو حامد غزالی کہتا ہے:

1۔ ایک شیخ ابتدائے کار میں ساری رات جاگ کر تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا تھا۔اس نے خود پر یہ لازم کیا کہ رات کو سر کے بل کھڑا رہے تا کہ اس کا نفس شب بیداری میں رغبت اور میلان پیدا کرے۔

---

[1] معالم الاصول،صفحہ 8۔

[2] اصولِ کافی،جلد 1،صفحہ 31،حدیث 5۔

[3] اصولِ کافی،جلد 1،صفحہ 30،حدیث 4۔

[4] اصولِ کافی،جلد 1،صفحہ 43۔

[5] اصولِ کافی،جلد 1،صفحہ 44،حدیث 3۔

[6] تلبیس ابلیس،صفحات 379،397۔

2۔ ایک اور شیخ نے دولت کی محبت سے آزاد ہونے کے لیے تمام مال جلایا اور دریا میں پھینک دیا، کیونکہ لوگوں کو دینار یا کاری میں مبتلا کر سکتا تھا۔

3۔ تیسرے شیخ نے حلم و بردباری کی عادت پیدا کرنے کے لیے کسی کو مقرر کیا کہ وہ اسے لوگوں کے سامنے برا کہا کرے۔

ابن الجوزی یہ عجیب کہانیاں بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ جو لوگ یہ الٹے کام کرتے تھے ان سے زیادہ تعجب مجھے ابو حامد غزالی پر ہوتا ہے کہ جس نے ان واقعات کو لکھنے کے بعد نہ صرف یہ کہ ان کی مذمت نہ کی بلکہ ان کو دوسروں کی تعلیم و تربیت کیلئے بیان کیا۔ کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص ساری رات صبح تک سر کے بل کھڑا رہے تاکہ خون اس کے دماغ میں اکٹھا ہو اور وہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جائے؟ کس اصول کے تحت اپنے اموال کو دریا برد کیا جا سکتا ہے جبکہ پیغمبر اکرمؐ نے مال کو ضائع کرنے سے منع کیا ہے؟ کیا کسی مسلمان کو بلاوجہ گالیاں دینا جائز ہے؟ کیا کسی مسلمان کو اس کام کیلئے ملازم رکھنا درست ہے؟ ابن الجوزی آخر میں کہتا ہے کہ ابو حامد غزالی نے تصوف پر فقہ کو سستے داموں قربان کر دیا!

4۔ غزالی کی ایک اور کہانی "غسل خانے کا چور" ہے۔ غزالی ابن کزینی نام کے ایک شیخ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ: میں ایک مرتبہ ایک علاقے میں گیا اور وہاں اچھی شہرت پیدا کر لی۔ میں نیک اور اچھے کام کرنے والا شخص سمجھا جانے لگا۔ اس اچھی شہرت سے نجات کیلئے میں ایک دن عوامی غسل خانے میں گیا اور وہاں سے ایک قیمتی لباس چرا کر اپنے پرانے لباس کے نیچے پہن لیا۔ غسل خانے سے نکل کر میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ لوگ میرے پیچھے بھاگے اور مجھے پکڑ کر میرا پرانا لباس اتارا اور قیمتی لباس باہر نکالا۔ اس واقعے کے بعد میں لوگوں میں غسل خانے کے چور کے طور پر جانا جانے لگا اور اس طرح میرے نفس کو راحت ملی۔ اس قصے کو بیان کرنے کے بعد غزالی کہتا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ اور نفس کے شر سے چھٹکارا پانے کے لیے اس طرح اپنے آپ کو اذیت دیتے تھے۔ کئی بار "اہلِ حال" ایسے کاموں کا ارتکاب کرتے تھے جو فقہی احکام کے خلاف ہوں تاکہ "دل کی اصلاح" ہو اور بعد میں اس ظاہری خطا کی تلافی کرتے تھے۔ جیسا کہ اس آدمی نے غسل خانے میں کیا۔ ابوالفرج ابن الجوزی ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: سبحان اللہ، کس نے غزالی کو فقاہت کے دائرہ سے نکال کر اس کتاب کو لکھنے پر مائل کیا؟ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ان کو صرف بیان کرنے سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ ان کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور ایسی حرکتیں کرنے والوں کو اہلِ حال کہتا ہے۔ اس سے برا حال کیا ہو گا کہ انسان اپنی اصلاح اور درستی کو شریعت کی مخالفت میں پائے۔ کیا دل کی اصلاح کا کوئی صحیح راستہ نہیں تھا کہ وہ ایسے کاموں میں مشغول ہونے لگے؟ کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو چور کہے اور اپنا تعارف ڈاکو کے طور پر کرائے؟ کیا لوگوں کا مال مالکان کی رضامندی کے بغیر لینا جائز ہے؟ جبکہ احمد اور شافعی (غزالی کے پیشواؤں) نے واضح کیا ہے کہ اگر کوئی شخص غسل خانے سے لباس چرائے، جبکہ وہاں نگہبان موجود ہو، تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ (ابو الفراج ابن الجوزی کی بات یہاں ختم ہوتی ہے۔) ایک ملاوٹی مکتبِ فکر میں اس طرح کے تضادات کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ایک طرف اسلام کی بات ہوتی ہے اور دوسری طرف درآمد شدہ غیر اسلامی تعلیمات کا تقاضا کہ ان حدود کو توڑا جائے اور اپنے مقصد کی طرف لوٹا جائے۔ کیا یوں غیر منطقی طریقے اور بے باکی سے اسلام کے مسلم احکام کے حریم کو توڑنا فکری آزادی اور آزاد اندیشی ہے؟ کیا کوئی مسلمان خدا کے احکام کے برخلاف اور ان کی مخالف سمت میں کھڑے ہو کر آزاد ہو سکتا ہے؟

3:ملاوٹی عرفان تفسیر بالرائے کا بانی ہے

اسلامی عرفان میں ہر جگہ وحی کے متن اور قرآن و سنت کی بات ہوتی ہے۔ مسلمان عارف کبھی بھی خود کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اپنی ذاتی آراء کو قرآن و سنت پر تھونپ دے اور ان کی اپنی خواہش اور رجحان کے مطابق تفسیر کرے۔ وہ آیات اور معتبر روایات کی تفسیر میں ایسے ضوابط کا خیال رکھتا ہے کہ ادبی قواعد، لغوی مفاہیم اور الفاظ کے عرفی معنی اور قرائنِ حالیہ و مقالیہ، غرض جو کچھ الفاظ اور معتبر عبارات کے مقاصد کو سمجھنے میں مدد دے، سے کام لے۔ لیکن ملاوٹی تصوف میں الفاظ قواعد و ضوابط سے آزاد کر دیئے جاتے ہیں، اور موم کی طرح من پسند صورت میں سامنے لائے جاتے ہیں۔ اسلامی متون پر تفسیر بالرائے حاکم ہو جاتی ہے۔ الفاظ کو کنایوں اور مجازات کا عنوان مل جاتا ہے۔ شاعرانہ و ذوقی مفاہیم اصلی مفاہیم کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یوں پہلے سے طے شدہ نتائج کو آیات و احادیث پر تھونپ دیا جاتا ہے۔ گویا اسلامی متون وہی کہتے ہیں جو یہ لوگ چاہتے ہیں۔ تذکرۃ الاولیاء کی ابتداء میں شیخ عطار صوفیوں کے مشائخ کے بارے جو لفاظی کرتا ہے وہ بہت سی باتوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ وہ کہتا ہے: جب تم قرآن و حدیث سے نکل آئے تو مشائخِ طریقت سے بہتر کسی کی بات نہیں ہے۔۔۔ ان کی بات عمل اور حال کا نتیجہ ہے، وہ حفظ و قال کا ثمر نہیں ہے۔ وہ بیاں نہیں، عیاں ہے۔ وہ تکرار نہیں، اسرار ہے۔ وہ علم حصولی نہیں، علمِ حضوری ہے۔ وہ کوشش نہیں، جوشش (ابال) ہے۔ وہ ادبنی ربی کا جہان ہے، علمنی ابی کی دنیا نہیں[1]!

ایسے لوگوں کے بارے میں یہ دعوے کہ جو نہ پیغمبر ہیں اور نہ امام معصوم، مشائخ اور پیروں کو کھلا میدان دیتے ہیں کہ وہ علم لدنی اور اسرار دانی اور حال و اعمال کے نام پر اسلامی نصوص کی من پسند تفسیریں کریں۔ اس بات کی واضح دلیل قرآن کی بعض تفسیریں ہیں جو اس طرز پر لکھی گئی ہیں، مثلاً فاضل بروسوی کی تفسیر روح البیان کے بعض حصے، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اگر الفاظ کو زبان کے قواعد و دستور، نیز لغوی اور عرفی مفاہیم سے آزاد کر دیا جائے تو ان کی اصالت اور قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر ہر گروہ اپنی مرضی سے تفسیر کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ قرآن و سنت رہنما اور اسوہ قرار پائیں، وہ ہر ایرے غیرے کے افکار کی توجیہ کرنے کا ذریعہ اور ان کے پیچھے چلنے والے بن جاتے ہیں۔ یوں ایک خطرناک صورتحال پیش آتی ہے جو کسی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں۔ ملاوٹی عرفان کے اس خطرناک جال میں پھنس جانے کی وجہ بھی وہی ملاوٹ کی طبیعت ہے۔ جب درآمد شدہ افکار اسلامی نصوص کے مطابق نہ ہوں تو مجبوراً تفسیر بالرائے کی مدد سے ان کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔ تصوف میں بہت سے فرقوں کے ظہور کی ایک وجہ یہی آیات اور احادیث کی تشریح میں آزادی ہے، جہاں ہر گروہ اپنی مرضی کے مطابق اسلامی نصوص کی تفسیر کرتا ہے اور اپنے ذاتی ذوق کے مطابق ان کی توجیہ کرتا ہے۔ ممکن ہے شروع میں صوفیوں کے کسی فرقے کے زیادہ پیروکار نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود یہی فرقہ کچھ عرصے بعد کئی دوسرے فرقوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ان میں سے کچھ فرقے کچھ عرصے بعد معدوم ہو جائیں گے اور ان کی بجائے دوسرے فرقے ابھریں گے۔

[1] تاریخِ تصوف، صفحہ 194۔

3۔ تصوف کی طرف رجحان کے محرکات

کسی بھی دوسرے سماجی رجحان کی طرح ملاوٹی عرفان کا بھی کوئی ایک معین سرچشمہ نہیں ہے۔ معمولاًان تمام مظاہر کے وجود میں آنے کے متعدد اسباب اور عوامل ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشروں میں تصوف کے ظہور کے عوامل میں درج ذیل چیزیں ضرور شامل ہیں، اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے علاوہ کوئی اور اسباب نہیں ہیں:

1: شدید مادی تمایلات

بہت سے معاشروں میں ایک گروہ جو مادی چیزوں سے سیر و مطمئن نہیں ہو سکتا وہ عرفان کی طرف چلا جاتا ہے۔ جب وہ حقیقی عرفان تک نہیں پہنچ پاتے، تو وہ لامحالہ راستے سے بھٹک کر ملاوٹی عرفان میں پھنس جاتے ہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی اسلامی معاشروں میں مادیت میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے تو کچھ عرصے بعد لوگ اس سے بیزار ہو جاتے ہیں اور تصوف کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ مادی چیزیں انسان کی پیاسی روح کو تسکین نہیں دے سکتیں لیکن ضروری ہے کہ ہر معاشرے کے پاس ایسے علماء کی جماعت ہونی چاہیے جو حالات حاضرہ سے باخبر ہو اور جو لوگوں کے دلوں کو صحیح الٰہی عرفان سے سیر کر سکے تاکہ وہ ملاوٹی عرفان کے جال میں نہ پھنسیں۔ یہ خود ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔

2: فقہاء کے بغیر اسلام

بہت سے معاشروں میں سیاست دانوں کی طبیعت یہ ہے کہ وہ لوگ فقہاء کی طاقت سے خوفزدہ ہیں اور ساتھ ہی وہ معاشرے کے اسلامی رجحان سے ہم آہنگ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ بھی تصوف کی طرف توجہ دینے کا ایک سبب ہے۔ کیونکہ تصوف ہمیشہ فقہاء کو ایک طرف رکھتا ہے اور معاملات کی باگ ڈور کسی پیر، مرشد، ولی اور قطب کے حوالے کرتا ہے جو دین کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ لہٰذا، بہت سے صوفی پیر اور شیوخ اپنے پیرو کاروں پر جو شرائط عائد کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فقہاء سے دور رکھیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ فقہاء کو قشری مولویوں، ریاکار زاہدوں اور دوغلے کردار والے واعظوں کے طور پر پیش کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ فقہاء کے بغیر اسلام کسی کیلئے خطرہ نہیں ہے۔ نہ استعماری پالیسیوں، نہ ظالموں کے تسلط، نہ آمرانہ حکومتوں اور نہ ہی کسی اور ظالم دھڑے کو للکارتا ہے۔ لہٰذا آمریت کے دور میں صوفی اور تصوف کی طرف مائل افراد بادشاہت کے اہم مہروں میں سے تھے۔ میں ساواک کے ایک خطرناک افسر کو کبھی نہیں بھولوں گا جن کا سامنا سابق دور حکومت کی گرفتاریوں کے دوران ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: "میرا ایمان یقیناً آپ سے کمزور نہیں ہے۔ میں ایک درویش ہوں۔ میں اپنے مولا سے عشق کرتا ہوں، اور میں نے جو کچھ اس سے مانگا ہے، مجھے ملا ہے۔ یہ سب ایک طرف، لیکن دوسری طرف اگر میں دیکھوں کہ لاکھوں لوگ شاہ کی مخالفت میں نکل آئے ہیں تو میں ان کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔" میں نے دیکھا کہ یہ درویش کتنی آسانی سے لفظ "لاکھوں" کہہ دیتا ہے ؟!

3: عملی بے راہ روی

کئی لوگ ایسے ہیں جو اپنی فطری خواہش اور داخلی ترغیب یا خاندانی پرورش اور ماحول کی وجہ سے مذہبی ہونا چاہتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ دین کے پابندیوں والے احکام اور حلال و حرام سے ناخوش ہیں جو ان کو اپنے ذاتی میلانات کے مطابق جینے سے روکتے ہیں۔ یہاں وہ ایک ایسے مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ان میں سے اکثر کو باطنی سفر کی طرف لے جاتا ہے اور انہیں تصوف کی طرح شریعت کی ظاہری شکل کا پابند نہیں رکھتا۔

وہ اپنے تئیں قلبی حالات کے نظارے کرتے ہیں، باہر کی دنیا اور گفتگو کے میدان سے نظریں چراتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں، وہ چھلکے کے بجائے مغز کی جستجو کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ماضی میں مٹھی بھر ظالم، جابر اور غیر شرعی کام کرنے والے وڈیرے پیر بن جاتے یا کم از کم صوفیوں کی صفوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ ان کا شریعت کے بعض احکام پر عمل نہ کرنا ایک طرح کی آزاد خیالی، لچک اور وسعت نظری شمار ہوتا تھا۔ شریعت کی پابندی کو ایک قسم کی خشکی اور شدت پسندی سمجھا جاتا تھا اور اسی وجہ سے بہت سی صوفیانہ محافل وجد اور سماع وغیرہ کا مرکز ہوتی تھیں۔

4: استعماری غلبے کے اثرات

بہت سے خِطوں میں تصوف کے پھیلاؤ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ صوفیاء داخلی دنیا میں مگن رہنے کی وجہ سے بیرونی دنیا سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ صلح کل کے اصول، جو کہ صوفیوں کا مذہب ہے، کی وجہ سے سب کے ساتھ اچھے تعلقات بنا کر رکھتے ہیں۔ وہ صلح و صفا کی زندگی چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیمات میں جہاد، حق و انصاف کے دشمنوں سے ٹکراؤ اور ظالموں اور جابروں کے پنجوں میں پنجے گاڑنا اور ان کے خلاف پر جوش بغاوت اور قیام جیسے مسائل کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس خانقاہ کے کونے میں رینگنا اور بیرونی دنیا سے نظریں چرانا ان کے عقائد سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ عوام کو بے حس کرنے کے لیے ایسے خیالات سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ اور اسی وجہ سے تصوف کی تاریخ میں، خاص طور پر ہمارے زمانے اور دور میں، استعمار کی چھاپ بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ مذہب، خصوصاً اسلام، کو اس کی فعال حالت سے دور کرنے اور اسے بے حسی کی دوا میں تبدیل کرنے کے لیے، انہوں نے خانقاہوں کو تقویت دینے پر اصرار کیا اور اس فرقے کے رہبروں کے اثر و رسوخ میں اضافہ کرنے پر زور دیا اور اب تک ایسا کر رہے ہیں۔[1] البتہ ان عوامل میں سے ہر ایک کی وضاحت کے لیے مستقل اور مفصل کتابوں کی ضرورت ہے۔ یہاں ہمارا مقصد ان کی طرف صرف اشارہ کرنا تھا اور عقلمندوں کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔

4۔ صوفیوں کا حالیہ جوش و خروش

پر شکوہ اسلامی انقلاب سے پہلے خاص طور پر ہمارے ملک ایران میں تصوف کے مختلف فرقوں کی طرف سے بہت سی سرگرمیاں منعقد کی جاتی تھیں۔ انہوں نے خانقاہیں بنائیں، کچھ حساس عہدوں پر قبضہ کیا، کچھ خواص ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور وہ عوامی سطح پر تصوف کی دعوت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ گھروں کے دروازوں پر مخصوص نعرے لکھ کر آویزاں کیئے جاتے تھے۔ تصوف کی حمایت میں کتابیں اور پمفلٹ شائع ہوتے تھے۔ صوفی ازم کو اخبارات کے صفحات پر نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ یہ سب ایک جوش و خروش اور "صوفی تحریک" کی نشانیاں تھیں۔ آج کل کونے کھدروں میں یہ سرگرمیاں دوبارہ شروع ہو گئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ تعجب کریں کہ ہمارے عہد اور زمانے میں، جسے سرگرمی اور کام کا دور سمجھا جاتا ہے، صوفیت جیسی تعلیمات کے خریدار کیوں پیدا ہو گئے ہیں، جب کہ تصوف انسانی تاریخ کے تاریک دور کے آثار میں سے ہے۔ وہ

---

[1] عرض مترجم: استعمار کی اپنی کوششوں کے علاوہ ایک نفسیاتی عامل بھی کار فرما تھا اور وہ یہ کہ زوال کے دور میں قومیں روحانیت میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ استعماری حکومت کے جبر نے مسلمانوں کو ذلت اور بے بسی کے احساس میں مبتلا کیا تو یہ بھی تصوف کی طرف رجحان میں اضافے کا ایک سبب بنا۔ اس سے پہلے تاتاریوں کے حملوں کے بعد بھی مسلم دنیا میں تصوف کو بہت شہرت ملی تھی کیونکہ لوگ دکھوں کو بھلانے کیلئے ایک خیالی دنیا بسانا چاہتے تھے۔ یوں صوفیوں کی دکانوں پر رش لگ گیا۔

لوگوں کو زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے سے روک کر خیالی دنیا کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ مسئلہ سادہ نہیں ہے اور اس کے پیچھے نفسیاتی اور سماجی عوامل کا ایک سلسلہ کارفرما ہے، جن کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا۔

1۔ بعض لوگوں کو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں رونما ہونے والے بہت سے واقعات کی طرح ان واقعات کا بھی ایک سیاسی مقصد اور پہلو ہے، اور بعض ظالم لوگ اس تحریک کے معاون ہیں۔ مختصراً، وہ اس پالیسی کو مذہبی گمراہی کو رواج دینے کی عمومی پالیسی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں تاکہ مختلف علاقوں میں تصادم، تقسیم اور اختلاف پیدا کیا جائے۔

عصری تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل مشرق کے دشمنوں نے ہمیشہ ان کے ذہنوں کو واقعیت سے کاٹنے اور ایک قسم کی لاتعلقی کی طرف لے جانے کی کوشش کی ہے اور یقیناً صوفیت اور صوفیانہ افکار، خانقاہ کے کونے میں رینگنے اور خیالی تصورات میں پناہ لینے سے بہتر کوئی چیز ان کے ذہن کو مطمئن نہیں کر سکی۔ لہذا، وہ ان افکار و تعلیمات کو فروغ دیتے ہیں۔ یقیناً جتنے لوگ ان مسالک کو اپنائیں گے ان کا بوجھ کم ہو گا اور ان کے مقاصد عملی جامہ پہنیں گے۔ یہ مشرقی ممالک میں ان فرقوں کی طرف رجحان اور ان کے پھیلاؤ کے پیچھے ایک عامل ہے جس کے اثرات مختلف مشرقی ممالک میں مختلف شکلوں میں نظر آتے ہیں۔ اگر ہم حالیہ صدیوں میں ابھرنے والے چند من گھڑت مذاہب کا گہرائی سے جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان سب میں تصوف اور صوفیانہ فکر موجود ہے۔ آج اگر کوئی واقعی جنید بغدادی کے حکم پر عمل کرنا چاہتا ہے تو اسے تمام کتابیں اور اخبارات پھینک دینا ہونگے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آج دنیا کے تمام ممالک دانش اور علم کو پھیلا کر اور جہالت سے لڑ کر اپنی عظمت کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ مان لینا چاہیے کہ ایسے الفاظ اس تاریک دور کے آثار ہیں جب سائنس سے لڑنا ممکن تھا اور جھوٹی تعلیمات کے خریدار مل جاتے تھے۔

2۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ رجحان جدید تہذیب کی ضروریات اور اثرات میں سے ایک ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ (خاص طور پر مشرق کے لوگ) خاندانی پرورش اور ماحول کی وجہ سے مذہبی معاملات میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور مختصر یہ کہ وہ مسلمان اور مذہبی ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف جدید تہذیب نے جو ذرائع فراہم کیے ہیں ان کے مکمل اور غیر مشروط استعمال کے لیے عمل کی ایک بے حساب آزادی درکار ہے جو مذہبی علماء اور مذہبی احکامات کے ذوق کے مطابق نہیں ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر حدود مقرر کرتے ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ جو ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتے، یعنی وہ مذہبی بھی رہنا چاہتے ہیں اور اپنی آزادی پر بھی کوئی قدغن قبول نہیں کرتے، وہ تصوف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو ان میں سے اکثر کو باطنی دنیا کے سفر کی طرف لے جاتا ہے اور شریعت کی ظاہری صورت پر اتنا اصرار نہیں کرتا جتنا کہ مذہبی علماء کرتے ہیں۔ تصوف کے کچھ فرقے دینی احکام کے ظواہر سے مکمل طور پر بے اعتناء ہیں۔ بعض لوگوں کے الفاظ میں: "وہ من کی دنیا کے حالات کو دیکھتے ہیں، باہر کی دنیا اور گفتگو سے تعلق نہیں رکھتے"۔ یا جیسے بعض نے کہا ہے: "انہیں مغز سے غرض ہے، چھلکے سے نہیں"۔ اس قسم کے

افکار کی بے شمار مثالیں اس کتاب میں واضح حوالوں کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔ کچھ بے بند و بار لوگوں، مٹھی بھر ظالموں اور ناجائز کسب و کار رکھنے والوں کا خود درویش بننا یا کسی بابے کا مرید بن جانا اس کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔[1]

البتہ صوفی اپنے پیروکاروں کے لیے جس نسبی آزادی کے قائل ہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے بہت غنیمت ہے اور وہ اسے ایک قسم کی "لطافت" سمجھتے ہیں اور اہل شریعت کی خشکی اور سختی کے مقابلہ میں لچک اور کشادگی قرار دیتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس نے بد قماش لوگوں کے ایک گروہ کو تصوف کے مختلف سلسلوں سے جوڑ دیا ہے۔ سچ پوچھیں تو صوفیوں کی محفلیں تفریح اور تنوع سے خالی نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر یہ سب ان لوگوں کے لیے جو روزمرہ کا سخت اور مشکل کام کرتے ہیں، ذہنی اور فکری تھکاوٹ کو دور کرنے کا ایک طریقہ اور توانائی کی تجدید کا ذریعہ ہے۔ ان کے پر ذوق اشعار جنہیں عام طور پر دھنوں اور پُر لطف آوازوں کے ساتھ گایا جاتا ہے، لوگوں کو ایک اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں، جیسا کہ وجد اور سماع کی بحث میں آئے گا۔ یہ دونوں چیزیں ماضی میں بہت سے صوفی فرقوں میں پائی جاتی تھیں اور آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں، یہ ان کو حال دیتی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اپنے اجتماعات میں منشیات کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے اور ان سے پیدا ہونے والے نشے کو روحانی مستی سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی محفلیں بعض لوگوں کی طبع کے مطابق ہوتی ہیں اور وہ انہیں مساجد میں ہونے والی محفلوں پر ترجیح دیتے ہیں جن میں یہ سب میسر نہیں ہوتا۔

3۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صوفی تحریک ایک قومی اور ادبی تحریک ہے۔ چونکہ ہمارے بعض بڑے شاعر اور ادیب صوفیاء میں سے تھے، اور ان کی تخلیقات کے احیاء کا تعلق بالواسطہ طور پر تصوف کے احیاء سے ہے، اور چونکہ بعض لوگ ایسے کاموں کے احیاء کے لیے زیادہ کوششیں کر رہے ہیں، اس لیے تصوف کو بھی زیادہ توجہ حاصل ہوئی ہے۔[2]

4۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صوفی سلسلوں میں لوگوں کا پناہ لینا بعض مذہبی علماء کی انتہا پسندی کا ردعمل ہے۔ اگرچہ یہ انتہا پسند یقینی طور پر علمائے بزرگ کی صف میں شامل نہیں ہیں، اور جو لوگ باخبر اور واقف ہیں وہ انہیں کبھی بھی علمائے مذہب نہیں کہیں گے۔ لیکن بہرحال نادان اور سادہ لوح

---

[1] صوفیاء میں وہ لوگ بھی تھے جو اپنی بے لگام دنیاوی زندگی سے تصوف کی طرف بھاگے۔ ابراہیم ادہم اور شبلی نے امارت اور حکومت چھوڑ کر تصوف میں پناہ لی۔ شقیق بلخی نے تجارت کی مصروفیت اور بازار کی چہچہاہٹ سے صوفی خانقاہ کا رخ کیا۔ ابو محمد سنبکی نے ڈاکے سے توبہ کی اور صوفی ہو گیا۔ شیخ احمد ژندہ پیل کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی شراب نوشی اور جرم سے فرار ہو کر تصوف کی طرف نکل گیا۔ (ارزش میراثِ صوفیہ، صفحہ 166۔)۔ داؤد الہامی

[2] عرضِ مترجم: ماضی کے شعراء کی تخلیقات کو پڑھنا اس دور کے سماج اور تاریخ کو سمجھنے اور ذخیرۂ الفاظ بڑھانے میں مددگار ہو سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ زبان کا استعمال ان سے نہیں سیکھنا چاہئے۔ زبان بنیادی طور پر تبادلہ خیال کا وسیلہ ہے، یہ واقعیت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہونی چاہئے۔ صوفیاء کا وطیرہ یہ ہے کہ جہاں ظاہری معنی مراد لینا ہو، وہ وہاں مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ جہاں مجازی معنی مراد ہو، وہاں ظاہری معنی مراد لیتے ہیں۔ ماضی میں مشرقی اقوام فکری و علمی طور پر جس پسماندگی اور سطحیت کا شکار تھیں، اس سے باہر نکلنے کیلئے جدید سائنس اور سماجی علوم کو سیکھنا ضروری ہے۔ تصوف نے لسانی آلودگی اور ابہام پھیلا کر مادری زبانوں کو جو نقصان پہنچایا اسی کی بدولت ہمارے معاشرے استبداد کا شکار رہے ہیں اور اب بھی استبداد کی مختلف شکلوں سے دوچار ہیں۔ ہر آمر تصوف کا مروج ہوتا ہے تاکہ عوام کو عقل کے استعمال اور حریتِ فکر critical thinking سے باز رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب صوفیاء کی علم دشمنی تھی، اسی وجہ سے مغربی اقوام کو مشرقی ممالک پر قبضے کا موقع ملا۔ بے جا قومی تعصب بھی مذہبی انتہا پسندی کی طرح احمقانہ ہے۔ صوفیوں کی غلط سوچ کی محض اسلئے ترویج کرنا کہ یہ لوگ ہماری قوم کا حصہ ہیں، درست نہیں۔ اس طرح ہم ماضی کی غلطیوں کو دہراتے رہیں گے۔

لوگوں کے ہاں ان کے اعمال کو طبقۂ علماء کے کردار کی ایک جھلک سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے جب عوام یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب کی بلند تعلیمات کے برعکس اس گروہ نے دنیا پرستی اور ہنگامہ آرائی پر خصوصی توجہ دی ہے تو وہ علماء سے بدظن ہو جاتے ہیں اور خانقاہ میں پناہ لیتے ہیں۔ اس رجحان کے اہم اسباب یہی بتائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تمام پہلو اس رجحان پر اثر انداز ہوئے ہوں، لیکن گمان یہی ہے کہ اصل اور بنیادی اسباب وہی ہیں جنہیں پہلے اور دوسرے نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔ جو شواہد بیان کیے گئے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ [1]

5۔ صوفیاء کے شاہکار

صوفیاء کے بھی اپنے شاہکار ہوتے ہیں اور تمام گمراہ فرقوں کی طرح وہ بھی زیادہ تر ان چالوں کے ذریعے اپنے مخالفین کے مقابلے میں اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ ہم یہاں ان سب کو بیان نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ ان میں سے کچھ کا ذکر بعد میں ان سے مناسبت رکھنے والے ابواب میں کرنا چاہیے، مثال کے طور پر جیسا کہ آپ "عقل اور عشق " کے باب میں دیکھیں گے۔ تاہم یہاں جس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تصوف کے رہنما اپنی پوری قوت سے اپنے آپ کو اور اپنے پیروکاروں کو معاشرے کے ایک اعلیٰ اور ممتاز طبقے کے طور پر متعارف کروانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل یقین، اہلِ دل، اہلِ معنی، اللہ والے اور دوسروں کو اہلِ ظاہر، اہلِ صورت اور بے مسلک طبقہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان تمام دعوؤں کے ساتھ ان میں چند پڑھے لکھے اور باشعور افراد بھی ہیں۔ یقیناً ان میں ایسے پڑھے لکھے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنے مذہب کی نظری بنیاد ڈھونڈنے میں بہت کوششیں کیں، لیکن اکثریت کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں کی ہے۔ اس لیے وہ انہی دعووں پر قائم رہتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو بڑے بڑے دانشوروں اور فقہاء سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ اپنی علمی قدرت کی وجہ سے ان کے مریدوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے ان کی ساری محنت پر پانی پھیر دیں گے۔ لہٰذا کسی بھی صوفی پیر کا پہلا حکم یہی ہوتا ہے کہ غیروں سے معاشرت ترک کی جائے۔ [2]

---

[1] یہ کہنا ضروری ہے کہ ایران میں صوفیوں کے حالیہ جوش و خروش کا سب سے مضبوط عامل سیاسی ہے اور یہ استعماری منصوبوں کا حصہ ہے۔ لہٰذا، تصوف کا فروغ پہلوی حکومت کی پالیسی کا مرکز تھا، اور برسوں یہ دیکھا گیا کہ مغربی ممالک سے مستشرقین orientalists ایران کی وزارت ثقافت کے تعاون سے تصوف کو بھڑکاتے رہے۔ مثال کے طور پر جناب گیپ کے بقول شیخ عطار کی تذکرۃ الاولیاء کو یورپ میں چھپوا کر ایران بھیجا جاتا رہا۔ ایک روسی مستشرق والنٹین زوکوفسکی نے ابو سعید کی اسرار التوحید کو پیٹرزبرگ میں تحقیق کے بعد چھاپا اور وہ ایران بھیجی گئی۔ طاغوت کے دور میں ایرانی وزارت ثقافت نے یونیورسٹیوں میں تصوف کو ایک مضمون کے طور پر متعارف کرایا اور صوفیوں کی کتب کی نشر و اشاعت پر ہر سال ایک خطیر بجٹ خرچ کیا جاتا رہا۔ (تحفۃ الاخیار، مقدمہ 108۔) داؤد الہامی

[2] صوفیاء میں کچھ شیخ ایسے بھی تھے جو پڑھنا اور لکھنا تک نہیں جانتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ پرانے مشائخ میں سے ایک ابو علی سیاح ان پڑھ شیخ تھا۔ وہ نہ کچھ لکھ سکتا تھا نہ پڑھ سکتا تھا۔ (تذکرۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 5۔) مولویہ سلسلے کا پیر صلاح الدین زرکوب ان پڑھ تھا اور روایات کے مطابق ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاذلی سلسلے کا شیخ داؤد کبیر لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ (طبقات شعرانی، جلد 1، صفحہ 188۔) کچھ صوفی علم کو حجابِ اکبر کہتے تھے اور بعض شیوخ کے احوال میں آیا ہے کہ انہوں نے حدیث کی کتابیں اور نسخے پانی میں بہا دیئے یا مٹی میں دبا دیئے۔ (ارزش میراثِ صوفیہ، صفحہ 167۔)۔ داؤد الہامی

فقہاء ہمیشہ صوفیت کے پھیلاؤ کے آگے واحد رکاوٹ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ عوام کو فقہاء کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کے لیے جو اہم ہتھکنڈے صوفی ہمیشہ استعمال کرتے ہیں یہ ہیں کہ ان کو اہلِ دنیا، ریاکار، خود نمائی میں مبتلا اور منافق کے طور پر متعارف کراتے ہیں، اور اس قسم کے اشعار ان کے بارے میں کہتے ہیں:

واعظان کاین جلوہ در محراب و منبر می کنند | چون بہ خلوت میروند آن کار دیگر می کنند

مشکلی دارم ز دانشمند مجلس باز پرس | توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

ضمناً اہل علم کے سرمایۂ علمی، جو صوفیوں کی غیر علمی گفتگو کے خلاف خطرناک ترین اسلحہ شمار ہوتا ہے، کو علمِ رسمی، علمِ ظاہر، قیل و قال، الفاظ و اصطلاحات وغیرہ جیسے عنوانات سے یاد کرتے ہیں۔ بزرگ علمائے دین کو قشری و ظاہری کہتے ہیں۔ کبھی دو قدم آگے بڑھ کر ان کو راہِ حق کے راہزن قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اگر ہمیں مولویوں نے اہلِ بدعت اور بعض اوقات ملحد قرار دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے باریک مفاہیم کو وہ نہ سمجھ سکے یا اہلِ دل کی اصطلاح سے آشنا نہیں تھے۔

تا نگردی آشنا زین پردہ رمزی نشنوی | گوش نامحرم نباشد جای پیغام و سروش

مجھے ایک نوجوان یاد ہے جو شیراز میں ان کی صفوں میں شامل ہوا تھا، اور اگرچہ اس کا پہلے علماء و فقہاء سے اکثر رابطہ رہتا تھا، لیکن اس نے ان سے اپنا تعلق توڑ لیا اور ان سے ایسے بھاگ گیا جیسے کوئی متعدی بیماری سے بھاگ رہا ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو دی گئی ابتدائی ہدایات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ فقہاء سے مکمل اجتناب اور کنارہ کشی اختیار کرے، اسے وہ اس کے لیے گویا ایک مہلک زہر سمجھتے تھے۔ بلاشبہ اس قسم کے مذموم پروپیگنڈے سے ناواقف لوگوں پر ان کا جادو چل جاتا ہے اور ان میں مایوسی اور شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ بعض اوقات اپنے فرقے کی حقیقت کے بارے میں معمولی سی وضاحت سننے یا اس موضوع سے متعلق علمی کتابوں کا ایک صفحہ پڑھنے کو بھی تیار نہیں ہوتے اور ان چیزوں کو حق تک پہنچنے کے راستے میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب شاہکار اس گروہ کے لوگوں کو، جو عام طور پر علمی سرمائے سے محروم ہوتے ہیں، مخالفین کے علمی ردسے بچا لیتا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ گروہ کی داخلی سیاست کے لحاظ سے جاہل مریدوں کو اہل علم کے حملوں سے بچانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے کہ "علم حجابِ اکبر ہے" کی قوالی کی جائے اور علم کو حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا جائے اور لوگوں کو علماء اور محققین سے بدظن کیا جائے، تاکہ وہ انہیں اپنا دشمن سمجھیں۔ شاید اس مشہور حدیث: "ایک وقت آئے گا کہ لوگ علماء سے اس طرح بھاگیں گے جیسے بھیڑیں بھیڑیوں سے بھاگتی ہیں"، میں اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔[1]

لیکن یقیناً اس شاہکار کو عملی جامہ پہنانا ان کے لیے اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ہر کوئی اس پروپیگنڈے میں آ کر منطقی بحث و مباحثے کو ایک طرف رکھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایسے مسائل کے حل اور اچھے اور برے عقائد میں فرق کا واحد ذریعہ علمی مباحثہ ہوتا ہے۔ علم سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا، اور اگر دنیا میں سعادت اور کامیابی کا راستہ پیدا کرنے کا کوئی چراغ ہے تو وہ علم ہی ہے۔ قرآن میں ایسے کئی گروہوں کی مثالیں دی گئی ہیں جو عالیشان

---

[1] بحارالانوار، جلد 22، صفحہ 453۔

انبیاء کی زبردست علمی منطق کے سامنے اسی قسم کی روش اپناتے تھے اور کہتے تھے کہ:لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَ الۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ.[1]،ترجمہ:"اس قرآن کو نہ سنا کرو اور اس میں شور مچا دیا کرو تاکہ تم غالب آجاؤ۔"

لیکن یہ ترکیب مؤثر ثابت نہ ہوئی اور قرآن نے عقل استعمال کرنے،critical thinking،کا یہ نورانی پیغام پہنچا دیا کہ:فَبَشِّرۡ عِبَادِ الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ ؕاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.[2]،ترجمہ": پس آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے، جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔"

6۔ روحانیت کے نام پر تفرقہ بازی

موجودہ عالمی حالات میں تشدد کی لہریں ہمارے معاشرے کی کشتی کو اس ہنگامہ خیز سمندر میں ادھر ادھر دھکیل رہی ہیں۔ سیاسی اور معاشی بحران اس کشتی کے مسافروں کے سامنے خوفناک بھنور کی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں نجات کا واحد راستہ یہی نظر آتا ہے کہ اس جہاز کی سربراہی دانشمند اور دیانت دار آدمیوں اور قابل اور تجربہ کار رہنماؤں کو سونپی جائے جو پوری مہارت سے نجات کے ساحل تک اس کی رہنمائی کریں۔

یہ واضح ہے کہ اس وقت اس جہاز کے مسافروں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف اور نفاق ان کی جان لے گا۔ زیادہ واضح طور پر کہا جائے تو اس موجودہ افراتفری کی دنیا میں ہمارے معاشرے کو اپنی موجودیت برقرار رکھنے کے لیے کسی بھی چیز سے زیادہ اتحاد اور اتفاق کی ضرورت ہے، اور اگر ہمارے پاس ان تمام مضبوط اور طاقتور دشمنوں کے خلاف کوئی ہتھیار ہے، تو یہ اتحاد ہے اور بس!

آج، ہمارے بہت سے دشمن ہیں، روحانی بھی اور مادی بھی، اور ایسے میں اگر ہم آپس میں خانہ جنگی شروع کرنا چاہیں تو کتنی بے وقوفی کی بات ہوگی۔

ہمارا ملک مختلف نسلوں اور زبانوں سے مل کر بنا ہے اور ان تمام مختلف گروہوں میں واحد مشترک چیز مذہب ہے، کیونکہ ان کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اس مقدس اتحاد کی اہمیت کسی وضاحت یا بیان کی محتاج نہیں۔ آج، سیاسی اور اقتصادی اتحادوں اور مشترکہ منڈیوں کے قیام اور اس طرح کی چیزوں کے ذریعے بڑی آبادیوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ محدود اور بکھرے ہوئے لوگوں کو ایسی متحرک دنیا میں رہنے کا حق نہیں ہے۔ ایسے حالات میں کیا اس ہدف کے خلاف جانا اور اتحاد کے رشتوں کو توڑنا جرم نہیں؟!

اسلام میں اتحاد کو برقرار رکھنا بہت اہمیت کا حامل ہے، اور یہ اس مقدس طاقتور اتحاد اور ایک جامع اور ہم آہنگ آبادی کے سائے میں تھا کہ اسلام کے آغاز میں مسلمان ان بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوئے۔ اسلام نے ان سے کہا تھا:وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّ لَا

[1] سورہ فصلت، آیت 26۔

[2] سورہ زمر، آیت 18۔

تَفَرَّقُوۡا.[1] ترجمہ: "اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔" اور یوں ان کو تقسیم ہونے سے صاف منع کر دیا تھا۔ اسلام نے منافقت کو اس قدر قابل نفرت سمجھا کہ اس نے اسے آسمانی سزاؤں کی فہرست میں شامل کر دیا اور کہا: قُلۡ ہُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ.[2]، ترجمہ: "کہہ دیجئے: اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے یا تمہیں فرقوں میں الجھا کر ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔"

اسلام ان لوگوں کے ساتھ ناقابل مصالحت دشمنی رکھتا ہے جو اختلافات بڑھاتے ہیں اور واضح طور پر کہتا ہے کہ: اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُہُمۡ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ.[3]، ترجمہ: "جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے بیشک آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کا معاملہ یقیناً اللہ کے حوالے ہے پھر وہ انہیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔" ایک اور جگہ اختلاف اور پراگندگی کو ان الفاظ میں شرک کی نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے: وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ. مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ.[4]، ترجمہ: "اور مشرکین میں سے نہ ہونا۔ جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور جو گروہوں میں بٹ گئے، ہر فرقہ اس پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔" اسلام کہتا ہے: وإیاکم والفرقة، فان الشاذ من الناس للشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب.[5]، ترجمہ: "جتھے بندی سے باز آجاؤ۔ اسلئے کہ معاشرے سے الگ ہو جانے والا ایسے ہی شیطان کے حصے میں چلا جاتا ہے جیسے گلے سے الگ ہونے والی بھیڑ بھیڑیئے کو مل جاتی ہے۔"

بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں بلکہ ہر معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دانستہ یا نادانستہ طور پر انتہا پسندی اور افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں بیدار کریں اور انہیں معاشرے میں واپس لائیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کو ہمارے اتحاد سے تکلیف ہوتی ہے اور ہمارے ہاں افراتفری کی صورت حال ان کی ذہنی یکسوئی کا سبب ہوتی ہے، اور ان کا ماننا ہے: چونکہ یوں ہے، اس لیے مزید انتشار پھیلانا چاہیے۔ پس بڑی احتیاط کے ساتھ ان کے منصوبوں پر نگاہ رکھیں اور انہیں بے نقاب کریں۔ چاہے ہم مذہبی ہوں یا دنیادار، مذہبی سیاست کے قائل ہوں یا قوم و زبان کی سیاست کرتے ہوں، سیاستدان ہوں یا مولوی، ہمیں کسی بھی صورت میں اتحاد کے اس مقدس دھاگے کو، جو کہ مذہب ہے اور جو ہمارے ملک کے کروڑوں لوگوں کے دلوں کے گوشوں اور روحوں کی گہرائیوں میں موجود ہے، ٹوٹنے نہیں دینا چاہیے۔ یہ روحانی سرمایہ ضائع نہیں ہونا چاہیے! کیا ہمارے پاس اس کی جگہ لینے اور اس خلا کو پر کرنے کے لیے کوئی اور چیز ہے؟ افسوس، اب بھی کچھ ایسے ہیں جو بغیر توجہ کیے جھگڑے بڑھانے والوں کے آلہ کار ہیں!

---

[1] سورہ آل عمران، آیت 103۔

[2] سورہ انعام، آیت 65۔

[3] سورہ انعام، آیت 159۔

[4] سورہ روم، آیت 32۔

[5] نہج البلاغہ، خطبہ 125۔

یہ واقعی حیران کن ہے کہ آج شیعوں اور سنیوں کے درمیان موجود فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور تمام مسلمان اپنے مشترکہ دشمنوں کے خلاف یک دل اور یک زبان ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ مادیت، الحاد اور بے دینی کے خلاف دنیا کے باقی مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی ایک قسم کا اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک مضبوط تعلق بناتے ہیں۔ لیکن کیا یہ درست ہے کہ ہم اس معاشرے کو ادھر ادھر کھینچیں یا مسجدوں کے ہوتے ہوئے گوناگوں خانقاہیں بنالیں؟ اسلام کی لغت میں مسجد کے سوا کوئی دوسرا سماجی مرکز نہیں ہے!

7۔ آج خانقاہوں کی تعمیر اور جتھے بندی کا زمانہ نہیں ہے

اسلام نے دو چیزوں کے خلاف سخت جد و جہد کی ہے: اسلام کے اندر جتھہ بندی، اور مسجد کے مقابلے میں روحانی دکانیں سجانا۔ اس بارے اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے میں آپ کی توجہ مسجد ضرار کی داستان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ نے اسلامی تاریخ میں بیان شدہ "مسجدِ ضرار" کی کہانی سنی ہوگی۔ مفسرین نے سورہ توبہ کی آیت نمبر 107 کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے مدینہ میں ابوعامر نام کا ایک عیسائی راہب رہتا تھا جس نے سابقہ مذہبی کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت کی بشارت کو پایا اور اسے خاص جوش و خروش کے ساتھ لوگوں میں پھیلایا۔ اس طرح مدینہ کے لوگوں میں ایک خاص امید اور دلچسپی پیدا ہوئی۔ ظہور اسلام کے بعد مدینہ کے لوگ جو کئی وجوہات سے پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت کے ظہور کے پیاسے تھے، آپ کے پیروکاروں کی صف میں شامل ہو گئے اور قدرتی طور پر ابوعامر جیسوں کا ڈیرہ سنسان ہو گیا اور اس کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ اس چیز نے ان کے دلوں میں حسد اور کینے کی آگ بھڑکائی جو اس کا سبب ہوئی کہ یہ لوگ اسلام کی ترقی کو سبوتاژ کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کریں۔ رسول اللہؐ کو ابوعامر کی تباہ کن سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے "فاسق" قرار دیا۔ وہ اب مدینہ میں مزید نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شام کی طرف بھاگا اور رومی شہنشاہ کے ہاں پناہ لی۔ لیکن اس نے اپنی سرگرمیاں بند نہیں کیں۔ وہاں سے اس نے خطوط کے ذریعے منافقین کے ساتھ خفیہ روابط رکھے، اس امید پر کہ وہ اسے مدینہ میں جگہ فراہم کریں گے اور وہ رومی شہنشاہ کی مدد سے مسلمانوں پر ایک مہلک ضرب لگائے گا۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف ایک دن لوگوں کا ایک گروہ جو بظاہر حق بجانب دکھائی دیتا تھا، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہوں نے مسلمانوں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو خدمت کی تھی اس سے پردہ ہٹا کر کہا: اے اللہ کے رسول ؐ! ہم نے دیکھا ہے کہ مدینہ کے دور دراز علاقوں سے کمزور، بزرگ، بوڑھے، عورتیں اور بیمار لوگ آپؐ کی مسجد میں حاضری سے قاصر ہیں۔ خاص طور پر بارش کی راتوں میں یہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کی مدد اور مسلمانوں کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے ہم نے مدینہ کے ایک کونے میں ایک مسجد بنائی ہے۔ مسجد کی تعمیر اب مکمل ہو چکی ہے اور آپؐ کا انتظار ہے کہ آپؐ تشریف لا کر اس کا افتتاح کریں۔ رسول اللہؐ اس وقت غزوۂ تبوک کیلئے عازم سفر تھے۔ آپؐ نے کہا: میں جا رہا ہوں، واپس آکر میں تمہارے کام کا فیصلہ کروں گا۔ آنحضورؐ کے واپس آنے کے بعد، وہ انہی چہروں کے ساتھ ان کی بارگاہ میں پہنچ گئے اور اپنی فریب کارانہ درخواست کو دہرایا۔ اچانک اس وقت پیغمبر اکرمؐ پر کئی آیات نازل ہوئیں اور سخت ترین لہجے میں خدا نے اپنے رسولؐ کو اس مسجد میں حاضری اور نماز پڑھنے سے منع کیا اور اسے تفرقہ اور کفر کا مرکز اور "جہنم کے گڑھے کے کنارے پر بنی عمارت" قرار دیا اور فرمایا: وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مَسۡجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفۡرًا وَّ تَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ مِنۡ

قَبْلُ ۔وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۔وَ اللهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۔فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۔وَ اللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ.[1] ترجمہ: "کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی ضرر رسانی اور کفر اور مومنین میں پھوٹ ڈالنے کے لیے، نیز ان لوگوں کی کمین گاہ کے طور پر جو پہلے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے ارادے فقط نیک تھے، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپؐ ہر گز اس مسجد میں کھڑے نہ ہوں، البتہ جو مسجد پہلے ہی دن سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو صاف اور پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

لیکن اس معاملے کی حقیقت کیا تھی؟... ابوعامر نے اپنے کارندوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کے لیے ایک مورچہ بنائیں تاکہ وہ مدینہ واپس آسکے اور شام میں جو معاہدے کر چکا تھا ان کے مطابق اپنے مذموم منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔ البتہ چونکہ اس وقت مدینہ کے علاقے میں ایسی عمارت تعمیر کرنا، وہ بھی ابوعامر کے نام پر، ممکن نہیں تھا، اس لیے مسجد کے مقدس نام کے تحت انہوں نے کمزور اور بے بس طبقے سے ہمدردی کے نام پر یہ منصوبہ تیار کیا، جس کے لیے اس سے بہتر عنوان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کے مذموم عزائم کی تکمیل ہوتی، خدا کی وحی نے پیغمبرؐ کو ان کے منصوبوں سے آگاہ کر دیا، اور منصوبے ناکام ہو گئے۔ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ مسجد کو تباہ کر کے زمین سے برابر کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس جگہ کو اہل مدینہ کے لیے کچرے کا ڈھیر بنا دیا تاکہ مسلمان ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور جان لیں کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور شگاف پیدا کرنے کے لیے یا اس کے نتیجے میں جو بھی عمارت تعمیر کی جائے، اسے تباہ ہونا چاہیے، چاہے وہ مسجد کے مقدس نام پر ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی روح ایسے مرکز سے نفرت کرتی ہے اور مسلمانوں کے اتحاد کی تعلق کو کسی قیمت پر توڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس مسجد کی کہانی جو بعد میں مسجدِ ضرار کے نام سے مشہور ہوئی، اسلامی تاریخ کے ان سبق آموز واقعات میں سے ایک ہے جس نے مسلمانوں کی روح پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

محترم قارئین، اس صورت حال میں کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام مسجد کے مقابلے میں "خانقاہ" بنانے کی اجازت دے؟ اور وہاں لوگوں کو عبادت اور ذکر الٰہی وغیرہ کے نام پر بلایا جائے، جب کہ اس کام کا واحد مرکز مسجد ہو؟ آپس کی بات ہے، اگر دال میں کچھ کالا نہیں تو کچھ لوگ ہم سے الگ کیوں ہو گئے؟ اپنے لیے الگ مرکز، جداگانہ اذکار اور مخصوص نعرے کیوں بنائے؟ حتیٰ آدابِ مجلس اور مصافحے کے طریقے بھی بدل لیے؟! درباروں کی تعمیر اور مرشد تراشی اسلام میں کہاں ہے؟ اگر ان کے پاس واقعی کوئی صحیح پیغام ہے جو قرآن اور اسلام کے پیشواؤں کے فرمائے ہوئے اصولوں پر مبنی ہے تو وہ اس کو عمومی طور پر سب مسلمانوں کے سامنے پیش کیوں نہیں کرتے تاکہ ہر کوئی اسے قبول کر سکے۔ یہ کھسر پھسر اور سرگوشی کس لیے ہے؟! ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید اور اسلام کے عظیم رہنماؤں کی طرف سے جو فرامین ہم تک پہنچے ہیں ان میں کوئی چیز نہیں چھوڑی گئی۔ عبادت کا دستور، تزکیۂ نفس، خدا سے تعلق، روح و قلب کی پاکیزگی، ذکر و فکر، اور مختصر یہ کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ ان میں ہے۔ جو کوئی مردِ عمل ہے، بسم اللہ کرے۔ ان میں شور و غل، جتھہ بندی، پیر بھائیوں کے گروہ بنانا، گوشہ نشینی، مرشد کی طرف بلانے اور سرگوشیوں اور رازوں کی کوئی بات نہیں ہے۔ اے صوفیو! خدا کیلئے بیدار ہوں اور اس حساس اور خطرناک صورتحال میں ان تفرقہ انگیزیوں سے باز آئیں اور دوسروں کی طرح مسلمانوں کی

---

[1] سورہ توبہ، آیات 107و108۔

صفوں میں شامل ہوں۔ مساجد میں واپس آئیں تا کہ ہم دشمنوں کے خلاف ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔[1] اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ.[2]، ترجمہ: "اللہ یقیناان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اس طرح لڑتے

---

[1] علمائے مذہب کے صوفیوں کی مخالفت کرنے کی وجوہات بہت سی ہیں۔ ان تمام وجوہات کو صوفیوں کے خلاف لکھی گئی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے اور ان پر تنقید کی گئی ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

1۔ خانقاہوں میں جانے کی وجہ سے عوام میں جتھے بندی اور جدائی: صوفیوں نے مسجد و مدرسہ، جو کہ متشرع افراد اور فقہاء کی پناہ گاہیں تھیں، کے مقابلے میں خانقاہ بنائی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے الگ آدابِ زندگی اور رسوم بھی بنالیں۔ یہاں سے صوفی سلسلوں کا ظہور ہوا اور اس طرح انہوں نے مسلم عوام، بالخصوص باصلاحیت اور صاحبِ دل افراد، کو تعلیمی اداروں اور خانقاہ کے درمیان انتخاب میں الجھادیا۔ (ارزش میراث صوفیہ، صفحہ 35۔)

2۔ زبان کی تباہی: صوفیاء نے اپنی گفتگو اور تحریروں سے الفاظ، مفاہیم اور معانی کی حدود کو توڑ دیا۔ نیز انہوں نے بالواسطہ طور پر مذہبی تقدس رکھنے والی اصطلاحات کی قدر کو کم کیا۔ انہوں نے خدا کے اسماء و صفات اور دیگر مقدس اور توقیفی الفاظ کو ان کے اصل مقام سے ہٹادیا اور ان کی جگہ کچھ اور الفاظ کو مجازی اور خفیہ معنوں میں استعمال کیا۔ جیسے: ساقی، شاہد، عشق، مئے، زنا، وغیرہ۔ انہوں نے بعض مذہبی جملوں کے معنی بھی بدل دیے۔ مثال کے طور پر شریعت میں کہا گیا ہے کہ گناہ نہ کرو۔ (بقیہ اگلے صفحے پر) ابن عربی نے کہا: "گناہ کو چھوڑنا گناہ ہے"۔ (حسنات العارفین صفحہ 37۔) شریعت کے حکم کے مطابق شیطان ملعون ہے۔ لیکن احمد غزالی نے کہا" : جس نے شیطان سے توحید کی تعلیم حاصل نہیں کی وہ زندیق ہے"۔ (حسنات العارفین صفحہ 32۔)

3۔ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں شرعاً ناجائز اور حرام کاموں میں دلچسپی کا اظہار کیا اور بالواسطہ سادہ لوح اور عام لوگوں کو لاابالی پن، فسق و فجور اور گمراہی پر اکسایا، جیسے لونڈے بازی اور شراب خوری وغیرہ۔

4۔ خدا کی معرفت کے علمی استدلالات، جو علمائے مذہب اور محافظینِ شریعت کے ہتھیار ہیں، انہیں بندے اور خالق کے درمیان ایک رکاوٹ اور پردہ قرار دیا۔ (شرحِ احوال باباطاہر، صفحہ 13۔)

5۔ صوفیاء کے ذاتی خیالات اور نفسیاتی مسائل کو وحی کی تعلیمات کی جگہ دی گئی۔ مثال کے طور پر بجائے یہ کہنے کے کہ نبی پاکؐ نے یہ کہا، یہ لوگ کہتے ہیں کہ حدثنی قلبی عن ربی، میرا دل میرے رب کی طرف سے یہ کہتا ہے۔ بعض اوقات نام نہاد اولیاء و شیوخ کی بعض بدعات اور رسومات کو سنت نبویؐ کے درجے اور مرتبے میں شمار کیا جاتا رہا۔ (مناقب العارفین، جلد 2، صفحہ 578۔) کہا گیا: البدعة الحسنة الصادرة عن کُمل الاولیاء کالسنة السنیه الوارده عن الانبیاء، یعنی "وہ بدعتِ حسنہ جو کامل ولیوں سے آئی ہو، سنت انبیاء جیسی ہے"۔ (الحکمۃ الترمذی و نظریۃ فی الولایہ، جلد 1، صفحہ 366۔)

6۔ سماع اور آلاتِ موسیقی کو استعمال کر کے خدا کی عاشقانہ عبادت کو خلاف شریعت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ کام صوفیوں کا معمول تھا اور وہ اسے انجام دیتے تھے۔

7۔ وحدتِ وجود کا مسئلہ بھی فقہاء کے اعتراض کا ایک سبب تھا۔ اس کی کسی حد تک شائستہ صورت ہمہ خدائی ہے۔ ابن عربی نے کہا: فسبحان من اظہر الاشیاء و ہو عینہا، یعنی "پاک ہے وہ جس نے موجودات کو ظاہر کیا اور وہ عین موجودات ہے"۔ (مقدمہ فصوص الحکم، صفحہ 25۔) (بقیہ اگلے صفحے پر)

ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"نیز:اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ.[1]،ترجمہ:"اس میں ہر صاحب دل کے لیے یقیناعبرت ہے جو کان لگا کر سنے اور (اس کا دل) حاضر رہے۔"

8۔ چہل مقالہ

جس چیز نے مصنف کو اس کتاب کو شائع کرنے پر مجبور کیا وہ "چہل مقالہ" کے نام سے چھپنے والا ایک کتابچہ تھا جسے تصوف کی طرف مائل ایک شخص نے شائع کیا۔ وہ طاغوت کے دور میں اپنی خدمت کی وجہ سے وکالت کی کرسی پر براجمان تھا اور قوم پرست وکیلوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کتاب میں اہل علم اور بزرگانِ دین کی توہین کی گئی تھی اور اس میں غیر منطقی باتیں اور توہین آمیز بیانات تھے جو پڑھنے والوں کی دل آزاری کا باعث بنے تھے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس کتاب میں میں صرف چہل مقالہ کی غلطیوں اور اس کے ناموزوں مواد پر بات کروں گا، لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ یہ ایک غلطی ہو گی کیونکہ الزامات کا یہ مجموعہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کا جواب دینا کسی کتاب کا محور بن جائے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ صوفی ازم کے بارے میں ایک جامع تر مگر مختصر کتاب لکھوں اور اس مسئلے کو سادہ اور واضح انداز خود صوفیوں کی باتوں کا حوالہ دیتے ہوئے، جہاں تک اس کتاب کے صفحات اور میرا محدود ذہن اجازت دیتا ہے، بیان کروں۔ لیکن آپ کے سامنے چہل مقالہ نامی کتابچے کے کچھ حصے بطور نمونہ پیش کرنا برا خیال نہیں ہو گا، تاکہ انہیں پڑھ کر آپ خود اس کے مواد سے کچھ آشنائی حاصل کر سکیں۔

1: چہل مقالہ کے صفحہ 13 پر مصنف جن فرقوں کو عقلمند دشمنوں یا جاہل دوستوں کی سرگرمیوں کے نتیجے کے طور پر متعارف کراتا ہے، ان میں ایک شیخی فرقہ ہے۔ اس میں ہم بھی مصنف سے متفق ہیں۔ ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انگلستان، جو فرقے بنانے میں خاص مہارت رکھتا ہے، "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کے مطابق اپنے زیر اثر علاقوں میں ایسے گروہ پیدا کرنے میں ناکام نہیں رہا۔ اس گروہ کا انحراف اس قدر یقینی ہے کہ "محمد کریم خان" کے اقرار کے مطابق، جو ان کے قائدین میں سے ہے، اس کے تمام ہم عصر علماء نے اس کے عقائد اور اس کے استاد سید کاظم رشتی اور اس کے استاد شیخ احمد احسائی کے عقائد کے باطل ہونے پر اتفاق کیا۔ لیکن ٹھہریئے! باباذہبی، جو اس سلسلے کے پیروں میں سے ہے جس کی چہل مقالہ کا مصنف بیعت کیے ہوئے ہے، شیخ احمد احسائی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ کتاب طباشیر الحکمۃ کے صفحہ 74 سے اس کی عین عبارت یہ ہے: "علم و معرفت کے شیخ مشائخ، شیخ احمد احسائی رحمۃ اللہ علیہ متاخرین کے زمانے میں حکمت، حدیث اور معرفت کے فضلاء میں سے ہیں۔ وہ فہم احادیثِ معصومیہ اور حکمت اشراقیہ میں ایک انوکھی طرز اور جدید اصطلاحات لے کر آئے ہیں جن کا فلاسفہ و صوفیاء کی اصطلاحات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اصطلاحات کو اقوالِ اہلبیتؑ سے اخذ کیا ہے۔ انہوں نے علوم و فنون کو حاصل کرنے کے ساتھ

فقہاء کے ان سب اعتراضات اور انتقادات کے جواب میں صوفی اپنی باتوں کی تاویلیں کرتے تھے اور علمائے مذہب کو قشری، اہلِ ظاہر، معنوی دنیا سے بے خبر، مغرض اور جاہ طلب قرار دیتے تھے اور ان کی مذمت کرتے تھے۔ (کیمیائے سعادت، صفحہ 29و30۔) داوٗد الہامی

[2] سورہ صف، آیت 4۔

[1] سورہ ق، آیت 37۔

ساتھ الٰہی عرفا، جیسے نخبۃ الاولیاء الربانیین، عمدۃ العرفاء المحققین، نقاوۃ اولاد سید المرسلین، سید قطب الدین محمد طاب اللہ ثراہ کی بیعت میں نفسانی ریاضتیں انجام دیں اور کشفِ عملی تک پہنچے۔ ان کی قابل قدر تصانیف میں شرح فوائد، شرح زیارت جامعہ وغیرہ مشہور ہیں۔" یہ ایک عجیب تضاد ہے۔[1]

1: علم حجاب ہے!

چہل مقالہ کا مصنف صفحہ 77 پر یوں لکھتا ہے: "بہت سے مشائخ و بزرگوں نے معرفت حاصل کرنے کی شرط ذہن کا مدرسے کی تعلیم سے خالی ہونے کو قرار دیا ہے۔ جب تک یہ صفائی نہ ہو ذہن معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ عارف معتقد ہوتا ہے کہ العلم ہو الحجاب الاکبر، یعنی علم سب سے بڑا پردہ ہے۔ رومی نے اس بارے میں کہا ہے:

بر نوشتہ ہیچ بنویسد کسی؟	یا نہالہ کارد اندر مغرسی
کاغذی جوید کہ آن بنوشتہ نیست	تخم کارد موضعی کہ کشتہ نیست

بقیہ اشعار کو ہم نے اختصار کی خاطر حذف کر دیا ہے۔[2] ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ اسلام نے حصولِ علم کو فرض قرار دیا ہے اور علم کو سیکھنا ہر مسلمان پر اس کی استطاعت کی حد کے اندر فرض قرار دیا ہے۔ بلکہ علم سیکھنے اور سکھانے دونوں کو فرض قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر قرآن کریم اور اسلام کے عظیم رہنماؤں کی بہت سی آیات اور اقوال موجود ہیں جن کی وضاحت کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ طالبِ علم پر استاد کے حقوق اور استاد پر طالبِ علم کے حقوق کے بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں، درس و تدریس کی کلاس کے ضوابط اور علم کو محفوظ اور ضبط کرنے کے احکامات اور سائنسی مسائل پر بحث و مباحثہ کے بارے میں جو تاکید کی گئی ہے، وہ سب اس کام کے فرض ہونے کی گواہی

---

[1] شیخ احمد احسائی سید محمد کا شاگرد تھا اور اس کے اکثر افکار اور شیخیوں کے باقی بڑوں کے خیالات صوفیوں سے ماخوذ ہیں۔ شیخ احمد احسائی کو اس کے زمانے کے علماء نے بعض عقائد کی تبلیغ کی وجہ سے خارج از اسلام قرار دیا تھا۔ اسکے ہم عصر علماء میں سے اکثر نے اس کو کافر یا منحرف قرار دیا۔ (بقیہ اگلے صفحے پر) ان علماء میں شہید ثالث محمد تقی برغانی، شیخ جعفر کاشف الغطاء، شیخ محمد حسن نجفی صاحبِ جواہر، آقا سید مہدی، آقا محمد شریف حائری، ملا محمد جعفر استر آبادی، شیخ ابراہیم موسوی قزوینی، آقا محمد حسن اصفہانی، ملا آقا دربندی، عتبات کے تمام علماء کے نام آتے ہیں۔ حتیٰ خود شیخ احمد احسائی کے بیٹے شیخ محمد نے اعلانیہ اظہار مخالفت کیا۔ داؤد الہامی

[2] بہت سے صوفیوں کے لیے حصولِ علم راہ میں رکاوٹ ہے۔ بعض مشائخ کے احوال میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتابیں اور احادیث کے مجموعے پانی میں بہا دیئے یا مٹی میں دبا دیئے۔ شمس تبریزی اور جلال الدین رومی کے درمیان ہونے والی ابتدائی گفتگو کے بارے میں مشہور ہے کہ شمس تبریزی نے بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کیا۔ شبلی نے کاغذی علم کے مقابلے پر جنون کا نام نہاد علم پیش کیا۔ ابن مسروق سے روایت ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ قیامت کے دن وہ حدیث کے ساتھ زیادہ مشغولیت کی وجہ سے اس دستر خوان سے محروم ہو گیا جو نبی مکرم ﷺ نے صوفیوں کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ (نقد العلم و العلماء، صفحہ 318۔) اسی وجہ سے جب بعض صوفیاء مجلس میں حدثنا و اخبرنا کے الفاظ سنتے، جو اصحابِ حدیث کا طریقہ تھا، تو مشتعل ہو جاتے اور چیختے کہ کب تک حدثنا و اخبرنا چلتا رہے گا، کیا ایک بھی ایسا شخص نہیں جو کہے حدثنی قلبی عن ربی؟ یہ وہ مقام ہے کہ جس کی وجہ سے صوفی اپنے نام نہاد حضوری علم کو روایتی علم سے جدا سمجھتے تھے۔ اس جہلِ مرکب کو صوفیوں کے اسرار کہا جاتا ہے۔ (ارزش میراث صوفیہ، صفحہ 167۔) داؤد الہامی

دیتے ہیں۔[1] خوش قسمتی سے اس دور کے ہر مسلمان نے اسلام کی ان ہدایات کو کم و بیش سن رکھا ہے۔ لیکن کیا یہ افسوسناک نہیں ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ دانش اور علم کو سب سے بڑی رکاوٹ اور پردہ گردانتا ہے اور سیکھے ہوئے علم کو دل کی تختی سے مٹا دینے کو معرفتِ خدا تک پہنچنے کی لازمی شرط سمجھتا ہے؟! اور "حدثنا" اور "اخبرنا" کہنے کو، جو رسول اللہؐ اور معصومینؑ کی احادیث کو بیان کرنے کا طریقہ ہے، قابلِ نفرت سمجھتا ہے؟ حیرت ہے کہ ایک صحافی جس کا فرض دانش، علم اور ثقافت کو پھیلانا ہے وہ الٹا لوگوں کو جہلِ مرکب کی طرف لے جا رہا ہے اور ان کو اس بات کی ترغیب دے رہا ہے کہ وہ علمِ حصولی کو ذہن سے مٹا دیں۔ بے زبان جانور اور پڑھے لکھے انسان میں کیا فرق ہے؟ کیا یہ اس کے علاوہ ہے کہ جانور کے دل کی تختی ان چیزوں سے پاک ہے جنہیں انسان زبان اور ریاضی کی مدد سے سیکھ سکتا ہے؟ آج جب کہ ہر قوم دانش اور علم میں ترقی پر فخر کرتی ہے اور ہر قوم اور ملک کا سب سے بڑا ہدف ثقافتی پیشرفت ہے، یہ صحافی اس قسم کے بے ہودہ اشعار ہمارے منہ پر مار رہا ہے:

یک اہلِ دل از مدرسہ ناید بیرون — ویران شود این مدرسہ دارالجہل است[2]

---

[1] اسلام نے علم اور سائنس کو سیکھنے پر ہمارے تصور سے زیادہ زور دیا ہے اور پڑھنے لکھنے کے رواج کو قائم کرنے کے لیے حصولِ علم کو عمومی فریضہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (اصول کافی، جلد 1، صفحہ 35۔) اس حدیث میں علم کا لفظ بغیر کسی شرط کے آیا ہے اور اس میں علوم کے تمام شعبے شامل ہیں اور تعلیم کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اس میں تمام مسلمان شامل ہیں اور جنس کی کوئی تفریق نہیں۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "گہوارے سے قبر تک علم حاصل کرو"، گویا مسلمانوں کو زندگی بھر علم حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ یعنی علم حاصل کرنے کا کوئی خاص موسم یا وقت نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے: "علم مومن کی گمشدہ میراث ہے، وہ اسے جہاں پائے حاصل کر لیتا ہے"۔ (منیۃ المرید، صفحہ 85۔) یعنی علم حاصل کرنے کی شرط صرف یہ ہے کہ علم درست اور صحیح ہو، واقعیت کے مطابق ہو۔ تعلیم دینے والا کوئی بھی ہو، کسی بھی مذہب اور قوم سے تعلق رکھتا ہو، اس سے علم حاصل کرنا چاہئے۔

اسلام کی نظر میں علم و معرفت کی کوئی خاص حد نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر روز اپنے علم میں اضافہ کریں۔ قرآن پاک فرماتا ہے کہ جو کچھ تمہیں علم و معرفت دیا گیا ہے وہ بہت کم ہے۔ تاکہ مسلمان مزید علم حاصل کرنے کی کوشش کریں: وَ مَآ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا، "اور تمہیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے"۔ (سورہ اسراء، آیت 85۔) اسلام نے انسان کے علم کو محدود نہیں کیا بلکہ یہ کہا ہے کہ فطرت کی قوتیں انسان کے تابع ہو سکتی ہیں: سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ، "جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے"۔ (سورہ لقمان، آیت 20۔)

بہرصورت یہ دینی احکامات کا وہ سلسلہ ہے جس نے حصولِ علم پر ہر قسم کی پابندیوں اور قدغنوں کو ختم کر دیا ہے اور لوگوں کو علم و دانش حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اسلامی ثقافت میں قلم pen اور لکھنا اتنا قیمتی اور اہم ہے کہ کوئی ان کی قسم کھا سکتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک سورت کے شروع میں خدا نے قلم اور تحریر کی قسم کھائی اور فرمایا: نٓ وَ الۡقَلَمِ وَ مَا یَسۡطُرُوۡنَ، "نون، قسم ہے قلم کی اور اس کی جسے لکھنے والے لکھتے ہیں"۔ (سورہ القلم، آیت 1۔) اسلام قلم کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس زمانے میں جب آپ کو سب سے زیادہ جنگوں میں لڑنے والے مجاہدین کی ضرورت تھی اور پے در پے جنگوں کا سامنا تھا، فرمایا: مداد العلماء افضل من دماء الشهداء، دانشوروں کا قلم شہداء کے خون سے بہتر ہے۔ داؤد الہامی

[2] چہل مقالہ، صفحہ 50۔

یہ لوگ اپنے پیروں کی تقلید میں بار بار یہی بات لکھتے ہیں کہ رائج سائنس اور انسانی علوم (humanities) کو پرے رکھ دیا جائے۔ بہتر ہو گا یہاں اس بات کو تھوڑا کھولا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ اکثر علوم دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پہلے مسلمہ مسائل جو اس علم میں زیر بحث نہیں آتے۔ دوسرے وہ مشکل مسائل جو بحث و مباحثہ کا موضوع ہوتے ہیں اور جنہیں صوفی قیل و قال کہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے معاملات غور و فکر اور تحقیق کے ذریعے حل ہو چکے ہیں جبکہ کچھ جوں کے توں باقی ہیں اور ان کے بارے میں مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں۔ سیاست، معاشیات، طب، فزکس، کیمسٹری وغیرہ کے مسائل سے لے کر مذہبی اور معنوی مسائل تک، سب اس اصول کے تابع ہیں۔ کیا ہمیں بحث مباحثے اور خیالات کے تبادلے کو برا سمجھنا چاہیے، جبکہ مشکل مسائل کو حل کرنے کا واحد راستہ یہی ہے، اور بڑے بڑے سائنسدانوں کی کوششوں کو قیل و قال جیسے بدصورت الفاظ سے روندنا چاہیے؟! ایسی باتیں لکھ کر بھی یہ حضرات لوگوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ان کی تحریروں کو سونے کے ورق کی طرح قیمتی سمجھیں اور انہیں بہت افسوس ہوتا ہے جب کوئی ان کو اہمیت نہ دے۔ چہل مقالہ کے صفحہ 37 پر لکھا ہے: ”میں نے ہر شعبے اور ہر موضوع بہت سے مضامین لکھے ہیں، لیکن ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کوئی شخص آئے اور ان کا پتہ لگائے، ان کی کھوج کرے اور ہم سے کسی شمارے کا تقاضا کرے۔“ عقل اور عشق کے باب میں حصولِ علم کی اہمیت پر مزید بات کی جائے گی۔

2: صلحِ کل کیا ہے؟

چہل مقالہ کا مصنف صفحہ 54 پر لکھتا ہے: ”صوفی مشائخ مختلف مسالک کے جھگڑوں اور اختلافات میں نہیں پڑتے تھے، بلکہ تمام گروہوں کے ساتھ صلح و صفا سے پیش آتے تھے اور سب کے ساتھ مساوی طور پر مہربان تھے!“[1]

---

[1] ایک ”صوفی“ کسی بھی عقیدے کو غلط نہیں سمجھتا اور مذاہب کے اختلاف کو رنگ و روپ کا اختلاف سمجھتا ہے اور صلحِ کل چاہتا ہے۔ وہ امیدواری اور خوشی بھی نہیں چاہتا۔ جلال الدین رومی اور عطار جیسے کامل عارفوں اور پختہ صوفیوں کا جوش و خروش، جو ان کی تحریروں کی ہر سطر میں عیاں ہے، اسی کا نتیجہ ہے۔ جب ایک صوفی اس حالت میں پہنچتا ہے تو وہ ”توازن“ کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی اس حالت میں اب اس کا کوئی ”سایہ“ نہیں ہے اور نہ ہی کسی چیز کی کوئی خاص خواہش ہے، بلکہ اس کے لیے سب کچھ برابر ہے اور وہ سب سے ایک ہی تناسب سے محبت کرتا ہے۔ صوفی کی نظر میں تمام فرقے، مذاہب اور فلسفے ایک سیڑھی کی مانند ہیں جن کی مدد سے وہ اوپر چڑھنا چاہتا ہے۔ ایک بار جب وہ اوپر چڑھ جاتا ہے، تو اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا ہے اور اسے کسی لگاؤ، تعلق یا تعصب کے بغیر چھوڑ دیتا ہے۔ (تاریخِ تصوف در ایران، صفحہ 429۔) ڈاکٹر غنی مزید کہتا ہے: ”ایک عارفِ کامل کی نظر میں مذاہب اور مسالک ایک ہیں اور وہ ان میں سے کسی کو ترجیح نہیں دیتا، یعنی اسلام اور بت پرستی اس کیلئے ایک جیسے ہیں۔ کعبہ و میخانہ، صمد و صنم ایک ہیں۔ پختہ صوفی کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ انسان کس مذہب کی پیروی کرتا ہے یا اس کی عبادت کی شکل کیا ہے۔ کیونکہ عارف کے نزدیک اصل مسجد پاک و صاف ہے اور خدا کی عبادت صرف پاک دل کے اندر کی جانی چاہیے“۔ (تاریخِ تصوف در ایران، صفحہ 426۔) صوفیاء کی نظر میں حق و باطل، فرعون و موسیٰؑ، شیطان و آدم، علیؑ و معاویہ، اسلام و بت پرستی، مسجد و بت خانہ ایک ہی ہیں۔ وہ دنیا کی ہر چیز سے عشق کرتے ہیں اور ان کا مقصود صلحِ کل ہے۔ اس لیے عین القضاۃ نے ابلیس و محمدؐ کے درمیان ٹکراؤ ایک سچائی کے دو متلازم اور متخالف پہلوؤں کے تصادم کے طور پر پیش کیا ہے۔ روزبہان بقلی نے اس مجمل بات کو مزید تفصیل کے ساتھ یوں بیان کیا ہے: ”شیطان وہاں فرشتوں کا سردار تھا اور سید نے کہا ہے کہ محمدؐ یہاں بنی آدم کے سردار ہیں۔ اگر سرور ابدی لطف کے مخزن ہیں تو ابلیس ابدی قہر کا ذخیرہ ہے جو لطف کا سبب بن گیا۔ گویا یہ حق کی دو صفات ہیں، لطف اور قہر، یضل من یشاء و یھدی من یشاء“۔ (شرح شطحیات، صفحہ 510۔) (بقیہ اگلے صفحے پر)

یہ بھی عجیب منطق ہے۔ کیا آپ واقعی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر کوئی، خواہ وہ ہزاروں غلطیوں اور جرائم کا ارتکاب کرے اور احکام الٰہی کی نافرمانی کرے، تب بھی اس کا احترام کیا جانا چاہیے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جانا چاہیے؟ کیا مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ نہیں تھا جو خود کو مسلمان کہتا تھا اور مولا علیؑ جیسی مقدس ہستی کا نام لے کر ان پر منبروں سے سب و شتم کیا کرتا تھا؟ کون سا دیندار مسلمان ایسے گروہ کے ساتھ صلح اور مہربانی سے پیش آسکتا ہے؟ کیا یہ عظیم دانشوروں کا فرض نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں میں پھیلی ہوئی توہمات سے نمٹیں اور ان سے لڑ کر اسلام کے دامن کو گندگی سے پاک کریں؟ جب ہم ان تمام انحرافات کو دیکھتے ہیں تو کیا ہمیں خاموش رہنا چاہئے اور سب کے ساتھ یکساں طور پر مہربانی سے پیش آنا چاہئے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں؟ دوسری طرف، ہم جانتے ہیں کہ متضاد بیانات کا مکمل طور پر درست ہونا ناممکن ہے۔ امام علیؑ کے اقوال میں بھی ہم یہ پڑھتے ہیں: مَا اخْتَلَفَتْ دَعْوَتَانِ اِلَّا كَانَتْ اِحْدَاهُمَا ضَلَالَةً.[1] ترجمہ: ”جب دو مختلف دعوتیں ہوں گی تو ان میں سے ایک ضرور گمراہی کی دعوت ہوگی۔“ ایسے میں کیا سب کے ساتھ صلح صفائی سے رہنا منافقت کے علاوہ کچھ ہوگا؟

بنیادی طور پر، اگر ہم اس لفظ صلحِ کل کا تجزیہ کریں اور اسے کھولیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے معنوں میں اجتماعِ ضدین ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے ملک میں جہاں دو متضاد سیاسی جماعتیں ہوں جو مختلف نظریات کی حامل ہوں اور ہر ایک خوشی اور ترقی کے راستے کو اپنے پیروکاروں کے لیے مخصوص سمجھتی ہو اور دوسری جماعت کو رسمی طور پر منحرف اور گمراہ قرار دیتی ہو، کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص مل جائے جو سب کے ساتھ چل سکتا ہو؟ مذہبی اختلافات بھی بہت سے معاملات میں ایسے ہیں۔ ایک گروہ نجات کو ایک مخصوص راستے میں منحصر سمجھتا ہے، جب کہ دوسرے گروہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اور صرف اپنے پیروکاروں سے صلح کی ہے۔ یہ واضح ہے کہ اگر کوئی سچ مچ سب کے ساتھ امن میں رہنا چاہتا ہے تو اسے ہر ایک کے عقائد اور اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا کردار اس آیت کے مطابق نہ ہو: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ-وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ-قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ-اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ.[2] ترجمہ: ”اور جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لا چکے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف ہنسی مذاق کرتے ہیں۔“

عین القضاۃ حضرت محمد ﷺ کو خدا کے جمال کا مظہر اور ابلیس کو خدا کے جلال کا مظہر سمجھتا ہے۔ (تمہیدات، صفحہ 73۔) آگے چل کر کہتا ہے: ”لیکن کیا تم نے کبھی سمجھا کہ اللہ کے دو نام ہیں، ایک الرحمٰن الرحیم اور دوسرا الجبار المتکبر؟ صفتِ جباریت سے ابلیس کو بنایا اور صفتِ رحمانیت سے محمد ﷺ کو، پس صفتِ رحمت آنحضور کی غذا ہے اور صفتِ قہر ابلیس کی غذا ہے“۔ (تمہیدات، صفحہ 73۔) اسمائے جلالی اور اسمائے جمالی کے بیچ اس قسم کا تقابل ابن عربی اور اس کے پیروکاروں کے صوفیانہ نظریات میں بھی نظر آتا ہے اور یہ اس مکتب کی اہم ترین نظری بحثوں میں سے ایک ہے۔ ان کے ہاں بھی شیطان خدا کے جلالی ناموں اور اس کے غضب کا مظہر ہے۔ منصور حلاج نے بھی کہا ہے کہ ”نورِ محمد ﷺ نورِ جمال سے ہے اور ابلیس نورِ جلال سے ہے“۔ (تمہیدات، صفحہ 126۔) اگرچہ ابلیس کی اس قسم کی ستائش اور اس کی نافرمانی کی اس قسم کی توجیہ بہت پست بات ہے لیکن اس کی بازگشت اسی صلحِ کل کے تصور کی طرف ہے۔ داوٗد الہامی

[1] نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، 183۔

[2] سورہ بقرہ، آیت 14۔

یہاں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے مشترکہ اہداف کے حصول کی کوششوں میں مل جل کر کام کرنے سے متصادم نہیں ہے۔ جس طرح سیاسی جماعتوں میں بھی اتحاد قائم ہوتے ہیں اور بعض مشترکہ مقاصد کیلئے مل کر کوشش کرنا ان کیلئے ناگزیر ہوتا ہے۔

3: ملامتیہ کون تھے؟

مذکورہ مصنف نے ملامتیہ کے عنوان سے بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ "صوفیاء کا ایک گروہ ملامتیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس فرقے کے حالات کا مطالعہ کرنا اور ان کے اخلاق و عادات کو جاننا یونانی فلسفیوں میں سے ایک کی یاد دلاتا ہے۔ مشہور فلسفی دیوجانس کلبی اس فرقے کے رہنماؤں میں سے ایک تھا۔ وہ اپنی لاپرواہی، شریعت کی ظاہری صورت کو نظر انداز کرنے اور رسم و رواج کی بے توقیری کے لیے مشہور ہیں۔" یہاں تک کہ وہ کہتا ہے: "ملامتیہ فرقہ میں ایسے لوگ تھے جو متین، مہذب، زندہ دل اور دلیر تھے، مگر اپنی نیکی، زہد اور خوفِ خدا کی نسبت سے پہچانا جانا ان کو پسند نہیں تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کو بے تقویٰ، شرابی اور شریعت کی ظاہری شکل کی پرواہ نہ کرنے والا سمجھیں تاکہ ان کے باطنی سیر و سلوک میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔" اس منطق پر پوری توجہ دیں اور پھر اس کا موازنہ اسلام کی دی ہوئی ہدایات سے کریں۔ اسلامی تعلیمات کے متون کا مختصر مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ افراد کے ایک دوسرے پر حسن ظن کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے اور مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی اور منفی سوچ اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ ہیں کیونکہ یہ سماجی بندھن کو توڑتی ہیں۔ جو چیز حسن ظن اور باہمی اعتماد کا سبب بنتی ہے اسلام اسے قبول کرتا ہے اور جو چیز بدظنی اور افشائے راز کا سبب بنتی ہے اس پر قدغن لگاتا ہے۔ تاہم ان کا خیال یہ تھا کہ روحانی اور باطنی سفر پر جانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ لوگ ان کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہوں۔ گویا حقیقت تک جانے کیلئے لاابالی بن کر شریعت کے ظواہر کو چھوڑنا ضروری ہے۔ یہاں ہم کتاب چہل مقالہ پر تبصرے کو ختم کرتے ہیں۔

9۔ صوفیوں کے فرقے

وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ.[1]

اگرچہ صوفی ہر جگہ اقلیت میں ہیں اور یہ صورت حال ان کو فطری طور پر اپنے مخالفین کے خلاف، جو ہر جگہ اکثریت میں ہیں، متحد کرنے کا سبب ہونی چاہئے۔ لیکن ان کے درمیان اتنے زیادہ اختلافات ہیں، اور ان کے درمیان اتنے مختلف مکاتبِ فکر اور گوناگوں تعلیمات والے سلسلے نظر آتے ہیں کہ ان کی فہرست بنانا واقعی تھکا دینے والا کام ہے۔[2]

---

[1] سورہ بینہ، آیت 4۔ ترجمہ: "اور جنہیں کتاب دی گئی تھی وہ واضح دلیل آنے کے بعد فرقہ فرقہ ہو گئے۔"

[2] صوفی فرقوں اور سلسلوں کی تقسیم اور کثرت کا سلسلہ پوری تاریخ میں جاری رہا اور بڑے بڑے شیخوں کے ظہور سے راستوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور صوفی مسلک کے پھیلاؤ اور ترقی کے دور میں اس سے بہت سی شاخیں نکلیں اور اب تک تصوف کے سلسلوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ مثال کے طور پر پانچویں صدی ہجری تک خراسان کے علاقے میں متعدد سلسلے ظاہر ہو چکے تھے۔ علی ہجویری خراسان کے پانچویں صدی ہجری کے شیوخ کے بارے میں لکھتا ہے: "میں نے صرف خراسان میں تین سو ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہے جن میں سے ہر ایک اپنا الگ مشرب رکھتا تھا، جن میں سے صرف ایک بھی پوری دنیا

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو سلسلوں کے پیروکار کھلم کھلا ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین بھیجتے ہیں اور ایک دوسرے کو ننگِ تصوف قرار دیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ دوسروں کے بارے میں نامناسب مکاشفے اور برے خواب بھی دیکھتے ہیں۔ ہر گروہ کی اپنی الگ گدی اور خانقاہ ہے۔ ایک پیر کے مرید دوسروں کے مراکز میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ ایک ایسا گروہ جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تہذیبِ نفس اور اخلاقیات کا تنہا علمبردار ہے اور دوسری طرف صلحِ کل کی مالا بھی جپتا ہے، اس میں اس قسم کے جھگڑے واقعی حیران کن ہیں۔ اور یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ معاملات اتنے سادہ نہیں ہیں۔ لذتوں اور ہوا و ہوس کو ترک کرنے کے اس دکھاوے کے پیچھے کچھ اور راز چھپے ہیں۔ زیادہ تر تنازعات کا بیج اس وقت بویا جاتا ہے جب ایک قطب اور پیر کے فوت ہو جانے سے پس ماندگان میں اس کی جانشینی پر عجیب و غریب جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور جو کچھ پوشیدہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات معاملہ رسوائی اور نزاع کی طرف چلا جاتا ہے اور اس طرح نئی شاخوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ ایک شاخ کئی نئی شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ تصوف کے اکثر سلسلوں کا یہی معاملہ ہے۔ بلاشبہ کسی بھی بااثر اور طاقتور شخص کے جانشینوں کے درمیان تنازعات ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر نہ تو وہ شخص اور نہ ہی اس کے جانشین اثر و رسوخ کی طلب رکھتے ہوں اور اس عہدے کو صرف سماجی، سیاسی یا ذاتی ترقی کے لیے ایک اوزار سمجھتے ہوں، تو مختلف جتھے اور شاخیں بننے کا خطرہ کم ہو گا۔ لیکن اگر وہ خود کو کسی مقام پر پہنچا ہوا سمجھتے ہوں اور دوسروں پر اپنے نظریات اور کشفیات کی اطاعت کو واجب سمجھتے ہوں اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا عقیدہ ہو، تو وہ مختلف سلسلے اور گروہ بنانے لگتے ہیں، اور یہی تصوف کی سب سے بڑی کمزوری اور ان لوگوں کی بدبختی کا ایک سبب ہے۔

تصوف کی تاریخ میں ان لوگوں کے بے شمار سلسلے اور گروہ درج کیے گئے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے عجیب و غریب عقائد و اعمال بیان کیے گئے ہیں، جن میں سے کچھ اتنے عجیب ہیں کہ ان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ تاہم اصل بات، یعنی ماضی اور حال میں ان کے مختلف سلسلوں کے وجود پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن خوش قسمتی سے بہت سے سابقہ سلسلے، خاص طور پر وہ جن سے عجیب و غریب عقائد منسوب ہیں، ناپید ہو چکے ہیں اور اس لیے آج ان پر بحث کرنا بے معنی ہے۔ ہمیں ان کی موجودہ نسلوں اور گروہوں سے ہی نمٹنا چاہیے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص تصوف کے بعض فرقوں کے پیروکاروں سے رابطہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے بارے میں شکایت کرتے ہیں[1] اور ایسے

کے لیے کافی تھا"۔ (کشف المحجوب، صفحہ 216۔) فرقوں کا یہ اختلاف طریقت کے پیروکاروں میں بہت تقسیم پیدا کر دیتا تھا، کیونکہ ہر گروہ کسی ایک شیخ کی قیادت میں کسی راستے پر حرکت کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وقت کے ساتھ ساتھ صوفیت میں متعدد طبقات اور فرقے سامنے آتے گئے۔ پیروں کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ ان کا مرید بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا اور شاگردوں کو اپنی طرف کھینچنا تھا۔ اگر کوئی پیر کسی علاقے میں داخل ہوتا تو مقامی پیر اس کی مخالفت شروع کر دیتے تاکہ اس کو وہاں سے بھگا دیں اور اپنی گدی اور میراث کو برقرار رکھیں۔ مثال کے طور پر عبد الرحمٰن جامی (898 ہجری) ژندہ پیل (536ھ) کے بارے میں لکھتا ہے: "خواجہ مودود چشتی اپنے شاگردوں کے ساتھ آیا تاکہ شیخ الاسلام ژندہ پیل کو، جو کہ جام سے آیا تھا اور لوگوں کی دینی رہنمائی کر رہا تھا، اسے صوبہ ہرات سے نکال دے یا اس سے اپنی بات منوالے"۔ (نفحات الانس صفحہ 327۔) داؤد الہامی

[1] رومی اپنے دور کے نام نہاد عارفوں کے بارے میں یوں شکوہ کناں ہے:

صوفی آن باشد کہ شد صفوت طلب — نہ لباس صوف و خیاطی و دب

صوفیٔ گشتہ بہ پیش این لئام — الخیاطة واللواطة والسلام

(ترجمہ اگلے صفحے پر)

لوگوں کے بارے میں شکایت کرتے ہیں جنہوں نے روحانی لباس اور خانقاہ کو اپنے دنیاوی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہوتا ہے۔ اس شکوے کی جھلک ان کے شاعروں کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خود بھی گروہ بندیوں اور تفرقے کے عامل ہوتے ہیں۔

بہر حال، چونکہ مقصد تصوف کا ایک کلی اور عمومی مطالعہ ہے، اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ صوفیوں کے مشترکات اور نارمل لوگوں سے ان کے فرق پر بحث کی جائے اور بعض صورتوں کے علاوہ ان کے مختلف سلسلوں کے مخصوص افکار کا ذکر کرنے سے گریز کیا جائے۔ ایک بار پھر دہرایا جاتا ہے کہ یہ مطالعہ ایک اجمالی اور مختصر بحث سے زیادہ نہیں ہے۔ جامع اور مکمل بحث کے لیے مفصل کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔ البتہ امید ہے کہ یہ مختصر کتاب ان لوگوں کے لیے کافی ہوگی جو ان کے مذہب کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

10۔ صوفیوں کے بنیادی نظریات

چونکہ مندرجہ ذیل پانچ موضوعات ایسے ہیں جو تقریباً ان کے تمام فرقوں میں مشترک ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان پر الگ الگ بحث کی جائے:
الف: عقل و عشق، ب: کشف، شہود اور خواب، ج: ریاضت، د: تفسیر بالرائے اور تاویل، ھ: قطب، پیر اور مرشد

ان مباحث کو شروع کرنے سے پہلے تصوف کی مختصر تاریخ بیان کی جائے گی تاکہ قاری اپنی بصیرت میں اضافہ کر کے ان موضوعات میں داخل ہو سکے۔ ضمناً یہاں صوفیوں کی چند کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے صوفیوں کا موقف نقل کیا گیا ہے: 1: احیاء العلوم، مصنف: ابو حامد محمد بن محمد الغزالی (متوفی 505 ہجری)، 2: تذکرۃ الاولیاء، مصنف: شیخ عطار (متوفی 627 ہجری)، 3: فتوحات مکیہ، مصنف: محیی الدین ابن عربی (متوفی 638 ہجری)، 4: مثنوی، مصنف: جلال الدین مولوی رومی (متوفی 672 ہجری)، 5: نفحات الانس، مصنف: شیخ جامی (898 ہجری)، 6: گلشن راز، مصنف: شیخ محمود شبستری (720 ہجری)، 7: فصوص الحکم، مصنف: محیی الدین ابن عربی (638 ہجری)، 8: شرح فصوص الحکم، مصنف: قیصری (751 ہجری)، 9: ریاض السیاحہ، مصنف: حاج زین العابدین شیروانی، 10: استوار نامہ، مصنف: کیوان قزوینی، 11: اسرار التوحید، مصنف: شیخ ابو سعید (440 ہجری)، 12: تاریخِ تصوف، مصنف: ڈاکٹر قاسم غنی، 13: طباشیر الحکمہ، مصنف: مرزا ابوالقاسم الذہبی، 14: التحفۃ العباسیہ، مصنف: شیخ محمد علی سبزواری

11۔ تصوف کی مختصر تاریخ

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ[1] .

ہم پہلے اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ مسلمانوں میں تصوف کا ظہور کیسے ہوا اور مسلم دنیا میں اس نے کیسے نفوذ پیدا کیا، لیکن ضروری ہے کہ اس مسئلے پر مزید غور کیا جائے: جیسا کہ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے بھی پہلے، ایک گروہ ایسا تھا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے جمال کے عاشقوں اور اللہ تک پہنچنے والوں کے طور پر متعارف کرایا۔ تاہم ان کے آغاز کے بارے میں معلومات مکمل نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ فرقہ دنیا کے کس حصے سے نکلا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی ہے، جب

ترجمہ: ”صوفی تو وہ ہے جو صفوت و پاکیزگی کا طلبگار ہو۔ صوفیت اونی لباس، خیاطی اور جبے پہننا نہیں ہے۔ آج کل کے کمینے لوگوں کے نزدیک تصوف لباس سینے اور لواط کرنے تک رہ گیا ہے۔“ داؤد الہامی

[1] سورہ یوسف، آیت 111۔ ترجمہ: ”بتحقیق ان کے قصوں میں عقل رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔“

کہ دوسروں کے مطابق اس کی جڑیں شام اور مصر کی قدیم تہذیب میں ہیں۔ البتہ تاریخ دانوں کے درمیان شاید اس بارے میں کوئی اختلاف رائے نہ ہو کہ یہ گروہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے دنیا میں موجود تھا۔

1:اسلام میں تصوف کا داخلہ

دوسری صدی ہجری میں، یعنی جب عباسی خلفاء نے دوسروں کے علوم کو پھیلانے اور ان کا عربی میں ترجمہ کرنے پر توجہ مرکوز کی اور اس طرح ترجمہ کرنے کا کام عام ہو گیا، تو فطری طور پر مختلف مذاہب کی منڈی پروان چڑھی۔ مسلمانوں میں اپنی جگہ بنانے والے مختلف مذاہب میں سے ایک مذہب تصوف بھی تھا۔ رفتہ رفتہ ان امور کی وجہ سے جن کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا، اس کے پیرو کار بڑھتے گئے اور خاص طور پر اہلِ سنت میں اس کے پیرو کار زیادہ ہوئے۔ آخر کار اس نے اہلِ تشیع کے اندر بھی اپنا جال پھیلالیا اور لوگوں کے ایک گروہ کو اپنے دام میں الجھالیا۔[1]

بعض روایات کے مطابق سرزمینِ اسلام میں اس فرقے کا بیج بونے والا پہلا شخص ابوہاشم کوفی تھا۔[2] کتاب "حدیقۃ الشیعہ" میں ابوہاشم کوفی کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کا یہ فرمان نقل کیا گیا ہے کہ:اَنّه كانَ فاسدُ العقيدةِ جداً و هُوَ الذّی اِبتَدَعَ مذهَباً يُقال لهُ التَّصَوُّفُ

---

1 غزالی کا ماننا ہے کہ روایتی سنی مذہب بہت خشک اور سطحی ہے اور اس میں اہلِ ایمان کا کام صرف کچھ آداب و رسوم rituals کو بجالانا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ مذہب اور روایت جذبات کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے اور اس وجہ سے بہت کم لوگ ہی ایسی زندگی کاٹ سکتے ہیں۔

تصوف میں جذبات کا بہت بڑا کردار ہے۔ غزالی نے الٰہیات میں رونق اور کشش بڑھانے کیلئے اپنے پاس سے تصوف کے صوفیانہ عناصر کو مذہب میں شامل کیا۔ یوں احساس اور محبت کے احساس نے اہلسنت کے خشک مذہب میں زندگی کی رمق ڈالی اور ایک تازگی پیدا کی۔ (تصوف و ادبیاتِ تصوف، ترجمہ سیروس ایزدی، صفحہ 51۔) اس کے برعکس شیعہ مکتبِ فکر خالص عرفان اور محبت سے بھرا ہوا ہے۔ خدا سے محبت اور آئمہ اطہارؑ کی ولایت اس کا مرکز ہے۔ ہر زمانے اور وقت میں اس کا ایک امام ہوتا ہے جس سے لوگ جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ شیعوں کو حقیقی عرفان و معرفت کے فیاض منبع تک رسائی حاصل ہے اور وہ اس منبع سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں، ایسے میں ان کو تصوف اور ملاوٹی عرفان کی کیا ضرورت ہے؟ صحیفۂ سجادیہ کی دعائیں، دعائے عرفہ، دعائے کمیل، دعائے صباح اور دعائے ندبہ وغیرہ، خالص اسلامی عرفان اور اللہ کی معرفت سے سرشار ہیں۔ اسی طرح توحید کے بارے میں احادیث کے وسیع ذخیرے اور دیگر تعلیمات کے ہوتے ہوئے صوفیاء کے انحرافی افکار کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے شیعوں میں تصوف کا رجحان بہت کمزور ہے۔ داؤد الہامی

2 "صوفی" کا لقب نبی ﷺ کے زمانے میں مستعمل نہیں تھا۔ صوفیاء کے اپنے دعوؤں کے مطابق بھی یہ نام دوسری صدی ہجری کے آخر میں یا اس کے بھی کچھ عرصے بعد ظاہر ہوا۔ (ترجمہ رسالہ قشیریہ، صفحہ 7۔) بظاہر جاحظ (متوفی 255 ہجری) وہ پہلا شخص ہے جس نے کتاب "البیان والتبیین" میں یہ لفظ استعمال کیا اور سب سے پہلے جس شخص پر یہ ٹھپہ لگایا گیا وہ ابوہاشم کوفی تھا۔ (البیان والتبیین، جلد 1، صفحہ 232۔) عبد الرحمٰن جامی نے سفیان ثوری کا یہ قول لکھا ہے: لو لا ابوہاشم الصوفی ما عرفت دقایق الریاء، "اگر ابوہاشم صوفی نہ ہوتا تو مجھے ریا کی باریکیاں معلوم نہ ہوتیں۔" وہ یہ بھی کہتا ہے: "مجھے ابوہاشم صوفی سے ملنے تک یہ پتا نہیں تھا کہ صوفی کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے زہد، ورع، نیکوکاری، توکل، تقویٰ اور خدا کی محبت کی راہ پر چلنے والے بڑے بڑے آدمی گزرے۔ لیکن صوفی صرف اسے کہا گیا۔ اس سے پہلے کسی کو صوفی کے نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صوفیوں کیلئے سب سے پہلی جو خانقاہ بنائی گئی وہ شام میں رملہ کے مقام پر تھی۔ اسے ایک مسیحی گورنر نے بنایا تھا"۔ (نفحات الانس، صفحہ 31۔) داؤد الہامی

وجَعَلَهُ مَفَرّاً لِعَقيدتِهِ الخَبِيثَة،[1] ترجمہ: ”وہ بہت ہی فاسد ذہن والا آدمی تھا اور اسی نے تصوف نامی مذہب ایجاد کیا اور اسے اپنے ناپاک عقیدے کا محور بنایا۔“ ان دلائل میں سے جو دوسری صدی ہجری میں اس فرقے کے ظہور کی تصدیق کرتے ہیں، اسی کتاب میں امام صادقؑ سے نقل شدہ روایت ہے کہ ان کے ایک صحابی نے ان سے عرض کیا: ان دنوں صوفیاء کے نام سے ایک گروہ نکلا ہے۔ آپؑ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا" : وہ (صوفی) ہمارے دشمن ہیں۔ جو لوگ ان کی طرف مائل ہوں گے وہ ان میں سے ہوں گے اور ان کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ عنقریب ان لوگوں کا ایک گروہ جو ہم سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی طرف مائل ہوں گے اور ان سے مشابہت اختیار کریں گے۔ وہ خود کو ان کے القاب سے ملقب کریں گے اور ان کی باتوں کی تاویلیں کریں گے۔ جو لوگ ان کی طرف مائل ہوں وہ ہم میں سے نہیں، ہم ان سے بیزار ہیں۔ جو لوگ ان کی باتوں کو رد کریں وہ ان لوگوں کی طرح ہونگے جنہوں نے رسول اللہؐ کے ہمراہ کفار سے جنگ کی۔“[2]

اس بات کی تائید اس چیز سے بھی ہوتی ہے کہ وہ احادیث جو صوفیوں کی مذمت اور ان کے طریقے کے رد میں آئی ہیں وہ اکثر امام جعفر صادقؑ اور ان کے بعد کے آئمۂ اطہارؑ سے مروی ہیں۔[3] اس بات کی دلیل صرف کتاب حدیقۃ الشیعہ کی روایات ہی نہیں ہیں بلکہ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بھی بحار الانوار کی جلد 11، 15 اور 17 میں اس موضوع پر روایات نقل کی ہیں۔ تاہم چونکہ اس کتاب حدیقۃ الشیعہ میں تصوف کی مذمت میں آنے والی احادیث زیادہ سخت ہیں، شاید اسی لیے تصوف کے حامیوں نے اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے سطحی باتوں کا سہارا لیا ہے اور کوئی راہِ فرار نکالنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ روایات سنی صوفیوں کی مذمت میں آئی ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ کتاب حدیقۃ الشیعہ من گھڑت ہے اور اسے بلا وجہ مرحوم مقدس اردبیلی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ جناب مقدس اردبیلی کی شخصیت شیعوں میں اتنی عظمت رکھتی ہے کہ کسی کو ان کی ذات کا انکار کرنے کی جرات نہیں ہوتی۔[4]

---

1 حدیقۃ الشیعہ، صفحہ 564۔

2 مقدس اردبیلی، حدیقۃ الشیعہ، جلد 2، صفحہ 747، قم، 1383 شمسی۔

3 بعض احادیث میں پیغمبر اکرم ﷺ نے صوفیوں کے بارے میں پیشگوئی کی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصوف انؐ کے دور میں نہیں تھا اور وہ آنے والے زمانے کے بارے میں لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا: ”قیامت تب تک نہیں آئے گی جب تک میری امت میں صوفیاء نامی ایک گروہ کھڑا نہ ہو جائے۔ ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ ذکر کیلئے حلقے بنائیں گے اور اونچی آوازیں نکالیں گے اور گمان کریں گے کہ میرے راستے اور طریقے پر ہیں۔ لیکن وہ کفار سے زیادہ گمراہ ہونگے۔ وہ دوزخی ہونگے۔ وہ گدھے کی طرح فریاد کریں گے۔“ (سفینۃ البحار، جلد 2، صفحہ 58۔) ایک اور روایت میں آپؐ یوں آنے والے دور کی خبر دیتے ہیں: ”اے ابوذر! آخری زمانے میں ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو گرمیوں اور سردیوں میں صوف کا لباس پہنیں گے اور اسے ایک فضیلت اور زہد و پارسائی کی علامت سمجھیں گے۔ آسمان و زمین کے فرشتے ان پر لعنت کرتے ہیں۔“ (حدیقۃ الشیعہ، صفحہ 563۔) امام رضا علیہ السلام سے بزنطی اور اسماعیل بن بزیع روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ”اگر کسی کے ہاں صوفیوں کا ذکر ہو اور وہ زبان یا دل سے ان کا انکار نہ کرے تو وہ ہم میں سے نہیں۔ جو کوئی صوفیوں کا انکار کرے ان لوگوں جیسا ہے جنہوں نے رسول اللہؐ کے سامنے راہِ خدا میں جہاد کیا۔“ (حدیقۃ الشیعہ، صفحہ 563۔) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی صوفیوں کی حمایت کرے وہ سچا شیعہ نہیں ہو سکتا۔ داؤد الہامی

4 اگر کتاب حدیقۃ الشیعہ جناب مقدس اردبیلی کی تصنیف نہ ہو پھر بھی صفوی دورِ حکومت میں دیندار شیعوں کے صوفی عقائد اور نظریات کے بارے میں رویے کو ظاہر کرتی ہے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

اس کے علاوہ بزرگ شیعہ علماء کی ایک بڑی تعداد، جن میں سے بعض بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں اور انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ دوسرے شیعہ علماء کے ساتھ گزارا ہے، نے کہا ہے کہ کتاب "حدیقۃ الشیعہ" مقدس اردبیلی علیہ الرحمہ کی ہی تصنیف ہے۔ محدث قمی نے سفینۃ البحار کی دوسری جلد کے صفحہ 57 پر اس کتاب کی تائید کرنے والے علماء کے نام لکھے ہیں 1 :: مرحوم شیخ حر عاملی (متوفیٰ1104 ہجری)، 2: مرحوم شیخ یوسف بحرانی (متوفیٰ1186 ہجری)،3: مرحوم ملا محمد طاہر قمی (متوفیٰ1098 ہجری)، 4: مرحوم میرزا عبداللہ آفندی (متوفیٰ1130 ہجری)، 5: مرحوم حاجی مرزا حسین نوری (متوفیٰ1320 ہجری)، 6: مرحوم شیخ سلیمان بن عبداللہ محقق بحرانی (متوفیٰ1121 ہجری)،7: مرحوم شیخ عبداللہ حاج بن صالح سماہیجی (متوفیٰ1135 ہجری)۔ اس کے علاوہ مرحوم محدث قمی نے خود بھی اس قول کی تصدیق کی ہے اور اسی کتاب میں جناب مقدس اردبیلی کی تصانیف میں سے ایک اس کتاب کو قرار دیا ہے۔

موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔ جیسا کہ مورخین نے صریح طور پر کہا ہے: مذکورہ زمانے (دوسری صدی ہجری) سے پہلے مسلمانوں میں صوفیوں اور تصوف کا کوئی باقاعدہ نام اور رسم نہیں تھی۔ اگر بعض پیشروؤں کے کلام میں لفظ "صوفی" دیکھا جائے تو یہ اسلام کے ابتدائی دور میں اس فرقے کے وجود کا ثبوت نہیں ہے، کیونکہ عرب اس لفظ کو اونی لباس پہننے والے پر لاگو کرتے تھے۔ مثال کے طور پر حسن بصری سے نقل ہوا ہے کہ: رأیت صوفیا فی الطواف و اعطیته شیئا فلم یاخذه، یعنی "میں نے طواف میں اونی لباس پہنے ایک شخص کو دیکھا۔ میں نے اسے کچھ دیا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔"

البتہ کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ صوف اور صوفی کے الفاظ امام صادقؑ کے زمانے میں ظاہر ہوئے اور اس سے پہلے عربوں میں نہیں تھے کہ اس قسم کے بیانات سے اس کے خلاف استدلال کیا جا سکے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ اس نام سے معروف گروہ اور مخصوص مسلک ان دنوں موجود نہیں تھا اور یہ قول جو حسن بصری سے نقل ہوا ہے اس سے کسی ایسے گروہ کی موجودگی پر دلیل قائم نہیں کی جا سکتی۔ بعض نے احتمال دیا ہے کہ "صوفی" کا لقب امیر المومنین علیؑ کے دور میں عام تھا اور اس کا اطلاق زاہدوں اور عابدوں پر ہوتا تھا۔ اس نظریہ کی تائید میں وہ روایت پیش کرتے ہیں جو کتاب عوالی اللیالی میں آنحضرتؐ سے منقول ہے۔ اس روایت میں ہم پڑھتے ہیں" : لفظ صوفی تین حروف پر مشتمل ہے: ص، و اور ف۔ ص کے تین ستون ہیں:

حدیقۃ الشیعہ کے مصنف صوفیوں اور ان کے عقائد پر سخت اور فیصلہ کن تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں: "سب سے پہلے صوفی کہلانے والا شخص ابوہاشم کوفی تھا، جو راہبوں کی طرح موٹا اونی لباس پہنتا تھا اور عیسائیوں کی طرح خدا کے مخلوق کے اندر حلول کرنے اور اس سے متحد ہونے پر یقین رکھتا تھا۔ عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیلئے حلول و اتحاد کے قائل تھے مگر اس نے اپنے بارے میں یہ دعویٰ کیا۔" (جلد2، صفحہ 560۔) قدیم صوفیاء کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ غالی سنی تھے: "اس گروہ نے زہد کا تظاہر کیا اور اپنے باطنی عقائد کو چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے خفیہ جگہوں پر اپنوں میں اپنے باطل عقائد کے بارے میں گفتگو کی۔ یہاں تک کہ شبلی کا دور آیا اور اس نے ان کے کچھ راز افشا کر دیئے۔ اس سے پہلے اس فرقے کے بزرگ کنایوں اور اپنی محفلوں میں یہ راز، کہ جو سب کے سب کفر پر مبنی تھے، رمز آلودہ جملوں میں بیان کیا کرتے تھے۔ اس حالت میں وہ مدہوشی کی اداکاری کر رہے ہوتے تھے۔ البتہ بایزید نے بے باکی سے کہا: لیس فی جبتی سوی الله، یعنی میری قمیض میں اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نیز کہا: سبحانی ما اعظم شانی، میں کس قدر پاک اور عظیم ہوں۔ وہ اصول میں ظاہری طور پر حلول و تشبیہ کا قائل تھا اور باطن میں بابکی مذہب پر کاربند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ملحد و زندیق تھا۔" داوَد الہامی

صدق، صبر اور صفا۔ و کے بھی تین ستون ہیں: ود، ورد اور وفا۔ ف کے بھی تین ستون ہیں : فرد، فقر اور فناء۔ جس شخص میں یہ صفات ہیں وہ صوفی ہے ورنہ ایک کوفی کتا بھی ہزار صوفیوں سے بہتر ہے۔"و الا الكلب الكوفي افضل من الف صوفي!

دانشنامہ کا مصنف اس روایت کو بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اب ہمیں اس روایت کے صحیح یا ضعیف ہونے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ آخر آپ کو اس سے کوئی سروکار کیوں نہیں؟ آپ نے لفظ صوفی کے بارے میں ایک لمبا چوڑا باب قائم کیا ہے، اب کھسیانے ہو رہے ہیں؟ بہر حال ہمیں اس کی صحت و سقم کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کتاب سے یہ روایت نقل ہوئی ہے، یعنی عوالی اللیالی، اس پر فقہ و حدیث کے ممتاز عالم شیخ یوسف بحرانی نے اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ مرحوم علامہ شیخ انصاری کے بقول شیخ یوسف بحرانی احادیث کی سند پر زیادہ نکتہ چینی نہیں کرتے۔ شیخ یوسف بحرانی نے کہا ہے: "اس کتاب کے مصنف حدیث نقل کرنے میں تساہل اور تسامح سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ درست اور غلط یا صحیح اور ضعیف میں فرق کا خیال نہیں رکھتے تھے۔" محدث الجزائری نے بھی اپنی ایک تصنیف میں کہا ہے کہ محققین اس کتاب سے احادیث بیان کرنے اور ان پر بحث کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ جی ہاں، اگر کوئی جان بوجھ کر صوفیوں کی باتوں پر کان دھرنا چاہے تو وہ مختلف فیصلہ کرے گا لیکن کوئی ضابطہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مدعی کی بات کو صرف اس کے دعوؤں کی بنیاد پر سچ سمجھ لیا جائے۔ جس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ایسے لوگ موجود تھے جو مسلمانوں میں اپنے زہد، تقدس اور قناعت کی وجہ سے مشہور تھے، جیسے حسن بصری، ربیع ابن خثیم اور اویس قرنی۔ یقیناً ان میں کچھ نیک تھے اور کچھ برے اور ریاکار تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی صوفی کے لقب سے مشہور نہیں تھا۔

2: سب پیر جعلی پیر ہوتے ہیں

بعض احادیث میں یہ خاص طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگر آئمہ معصومینؑ کے چاہنے والے تصوف کی طرف مائل ہوں گے تو آئمہؑ ان سے بیزار ہوں گے۔ ان میں سے ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام علی نقیؑ نے صوفیوں کی سخت مذمت کی تو ان کے ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر وہ صوفی آپ کے حق کی معرفت رکھتا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ امامؑ نے غصے کی حالت میں اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ یہ کہنا بند کرو، جو بھی ہمارے حق کو پہچانتا ہے وہ اس راستے پر نہیں چلے گا جس سے ہمیں تکلیف پہنچے۔ یہاں تک کہ آپؑ نے فرمایا: والصوفية كلهم من مخالفينا و طريقتهم مغايرة لطريقتنا[1] . ترجمہ: "صوفی سب کے سب ہمارے مخالف ہیں اور ان کا راستہ ہمارے راستے سے جدا ہے۔"

3: تصوف کو اسلامی رنگ و روپ کیسے ملا؟

چونکہ ایسے مسالک جس ماحول میں بھی داخل ہوتے ہیں اسی ماحول کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، تصوف کے حامیوں نے بھی جلد ہی اسے اسلامی رنگ دے دیا اور اس میں اسلامی ثقافت اور تعلیمات کا ایک حصہ ملا دیا۔ اپنے عقائد کو اسلامی عقائد اور احکام کے مطابق ڈھالنے کے لیے انہوں نے جن آیات اور احادیث کا سہارا لیا ان میں سے اکثر متشابہ تھیں۔ آخر کار انہوں نے ابتدائی دور کے زہاد اور رسول اللہؐ کے بعض مشہور و معروف اصحابؓ، جیسے سلمان اور ابوذر، رضوان اللہ علیہم کو اپنے گروہ کا حصہ قرار دیا اور یہاں تک کہ اپنے بعض سلسلوں کا بانی مولا علیؑ کو قرار دے دیا۔ ان دعوؤں کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

---

[1] محمد تبریزی، الہدایا لشیعۃ شرح اصول کافی، جلد 1، صفحہ 106-107، قم، 1429 ہجری۔

آج بھی پہلی صدی ہجری کے بزرگوں سے اپنا تعلق برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے شیوخ کا ایک سلسلہ بنا رکھا ہے کہ جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، اور یوں مختلف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ تاہم چونکہ اسلامی طرز فکر اور تربیت بنیادی طور پر اسلام کے اندر کسی بھی جتھہ بندی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، اس لیے تصوف کے تمام اصولوں کو اسلامی عقائد اور احکام کے مطابق ڈھالنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ تمام کوششوں کے باوجود صوفیاء کا کاروبار زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا اور ان پر ہر طرف سے اعتراض ہوا۔ بہرحال ہر دور میں کونے کھدروں میں ان کے مداح رہا کرتے تھے، جن کی تعداد وقت اور ماحول کے مطابق کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہتی تھی۔

4: صوفیت کی پراکندگی اور انحطاط

تصوف کے اہم اثاثوں میں سے ایک ذوق اور استحسان کا استعمال ہے، جسے بعض محققین نے عرفان بافی قرار دیا ہے۔[1] ظاہر ہے کہ اس کا کوئی مقررہ معیار یا ضابطہ نہیں ہے اور اسے موم کی طرح کسی شکل میں بھی ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس لیے تصوف میں آئے روز نئے نئے خیالات ایجاد ہوتے رہے اور شامل ہوتے رہے۔ لہٰذا زیادہ دیر نہیں لگی کہ اس شعبے میں بہت سی شاخیں نمودار ہوئیں، جن میں سے ہر ایک کی اپنی الگ روش اور نظریات تھے۔ اس بارے میں کتابیں لکھی گئیں اور بہت زیادہ شاعری کی گئی۔ اب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر آج ہم تصوف کی سبھی شاخوں اور ہر ایک کے عجیب و غریب عقائد کے بارے میں گفتگو کرنے بیٹھیں تو یقیناً بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ ان کے سلسلوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور گاہے بگاہے جب کوئی پیرِ طریقت فوت ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ مختلف رجحانات اور عقائد رکھنے والے کئی نئے پیر لے لیتے ہیں۔ البتہ یہ ایک فطری امر ہے کہ کوئی بھی گروہ یا فرقہ جو معین ضوابط اور معیارات نہ رکھتا ہو اور تصوف کی طرح ذوق و استحسان اور مکاشفہ و خواب کے محور پر گھومتا ہو، اس کا یہی حشر ہوگا۔ یہ اختلافات زوال کے لیے زمین کو تیار کرتے ہیں۔

دوسری طرف دانشمندوں اور علمائے دین کی سرگرمیوں، جدید ٹیکنالوجی کی بدولت کتابوں کی اشاعت کے ذرائع کی فراہمی، رابطے میں آسانی اور دیگر عوامل کی وجہ سے آنکھیں اور کان کھل گئے اور بہت سی چیزوں سے پردہ اٹھ گیا۔ اس دوران تصوف کا محل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے اور بابوں کے بازار کی رونق ماند پڑ رہی ہے۔ جس طرح قدیم یونانی فلسفہ، جس نے دنیا کو چار عناصر کی چار دیواری میں قید کر رکھا تھا اور حیاتیات کی وسیع دنیا کو چار کیلوں کے ساتھ باندھنا چاہا تھا، کو سائنس کی ترقی نے فناء کی گھاٹ اتار دیا، اسی طرح تصوف کی راہ و رسم بھی بزرگ علمائے کرام کی محنتوں اور عوام کے اذہان کے روشن ہونے سے انحطاط کا شکار ہے۔

مزید واضح طور پر کہوں تو اب وہ دن نہیں رہے کہ کوئی شیخ صفی الدین اردبیلی کی اس بات پر یقین کرے کہ: "میں نے چالیس دن اور چالیس راتیں ایک وضو کے ساتھ گزاریں"![2] یا کوئی بایزید بسطامی کے عجیب و غریب دعووں کا خریدار بنے، جیسا کہ جب اس سے کہا گیا کہ قیامت کے دن لوگ پیغمبر اکرمؐ کے جھنڈے تلے ہونگے تو اس نے کہا، لوائی اعظم من لواء محمد، یعنی "میرا جھنڈا آنحضورؐ کے جھنڈے سے بلند ہے۔" یا یہ کہ کوئی حسین بن منصور حلاج کے غلط کاموں کے بارے میں سنے اور ان کو برا نہ سمجھے۔ شیخ عطار اپنی کتاب تذکرۃالاولیاء میں نقل کرتا ہے کہ "منصور حلاج نے بیس سال اپنا لباس نہ اتارا۔ ایک دن زبردستی اس کا لباس اتارا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس میں جوئیں پڑ چکی تھیں۔ ایک جوں کو تولا گیا تو اس

---

[1] عرض مترجم: یہ اصطلاح سب سے پہلے آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ محمد حسین نجفی ڈھکو نے تحفۂ صوفیہ کے مقدمے میں استعمال کی تھی۔

[2] صفوۃالصفا، صفحہ 258

کاوزن ایک دانے کے برابر نکلا"۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ اپنے جسم کی صفائی کیسے کرتا ہوگا؟ اسی صفحے پر آگے چل کر لکھتا ہے: "منصور حلاج ایک سال تک کعبے کے سامنے دھوپ میں کھڑا رہا یہاں تک کہ اس کے اعضا سے تیل نکل کر پتھروں پر گرنے لگا"۔ اگر کوئی صوفیوں کی اپنی کتابوں میں ان کے حالاتِ زندگی پڑھے تو اس قسم کے بہت واقعات ملیں گے۔ آج کون ہے جو ان باتوں کو دیکھے اور ان کے طرفداروں کو خرافاتی اور ان نظریات کو خرافات نہ کہے؟ یہ گروہ جو آپ دیکھ رہے ہیں اب بھی ملاوٹی عرفان کی دکان چلا رہا ہے وہ اس لیے بچ گیا ہے کہ اس نے اپنے حالات اور طریقہ کار پر نظر ثانی کی ہے اور اپنے پیشروؤں کے بعض عقائد اور طرز عمل کو ایک ایسی شکل میں تبدیل کر دیا ہے جو رائے عامہ سے کسی حد تک سازگار ہے۔ اگر کوئی اس بات کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ تصوف کے پیش روؤں کی کتابوں، جیسا کہ تذکرۃ الاولیاء اور صفوۃ الصفا وغیرہ، اور تصوف کے راہنماؤں کے حالاتِ زندگی پر لکھی گئی پرانی کتابوں کا جدید دور میں لکھی گئی کتابوں سے تقابل کر کے دیکھے۔

12۔ صوفیوں کے بیانئے کی جڑیں

اس جمعیت کے نظریات کی جڑوں اور ان کے تفکر کی بنیادوں کا نچوڑ یہ چار چیزیں ہیں:

1۔ وہ تعلیمات جو سنی سنائی باتوں کے ذریعے اس طرز فکر کے ہندوستانی، شامی یا دیگر راہبوں سے صوفیوں تک پہنچی ہیں۔

2۔ قدیم یونانی تعلیمات اور افکار کا ایک حصہ جو ان کی کتابوں کے عربی میں ترجمہ ہونے اور مسلمانوں میں نشر ہونے کے بعد اس میں شامل ہوا۔ انگلستان سے تعلق رکھنے والے محقق سر جان میلکم نے تاریخ پر اپنی کتاب میں لکھا ہے: "تصوف کے سلسلوں کے بڑے شیوخ ارسطو اور افلاطون کے اقوال سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کی معروف کتابوں میں افلاطون سے بہت کچھ نقل کیا گیا ہے"۔ آگے چل کر کہا ہے کہ: "اگر فیثا غورث کی سوانح حیات اور افکار کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تو یہ تصوف کے پیروں میں سے کسی ایک کی سوانح حیات اور نظریات جیسا معلوم ہوگا۔ الوہیت کے اسرار میں اس کے داخل ہونے کا افسانہ، اس کا خیالات میں غرق رہنا، اس کی خارق عادت حرکتیں، موسیقی کا شغف، اس کا اپنے شاگردوں کی تربیت کرنے کا طریقہ، اس نے جو مشقتیں کیں اور جس طرح اس کی موت ہوئی، یہ سب کسی صوفی بزرگ کی سوانح حیات جیسا ہے"۔ اگرچہ یہ بات ہر صوفی اور ہر یونانی فلسفی پر صادق نہیں آتی، لیکن یہ اجمالی طور پر صوفی عقائد میں یونانی افکار کی آمیزش کی تصدیق کرتی ہے، بالخصوص اشراقی فلسفہ ان لوگوں کے افکار سے زیادہ قریبی نسبت رکھتا ہے۔

3۔ شعر و شاعری کی ایک میراث جو کہ شعری اور عرفانی ذوق رکھنے والوں نے وقت گزرنے کے ساتھ تخلیق کی اور اس میں متذکرہ بالا دو عناصر شامل ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افکار صرف اشعار کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔

4۔ اسلامی تعلیمات اور حقائق کا وہ حصہ جن کو تاویلیں کر کے سابقہ تین اصولوں کے قریب لایا جا سکتا تھا۔

واضح ہے کہ اس معاملے، یعنی صوفیوں کے عقائد کے مختلف ذرائع سے جمع ہونے کے نتیجے میں اکثر ایسے تضادات پیدا ہوتے ہیں جنہیں لامحالہ تاویلیں کر کے حل کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاویل اور توجیہ کو مسلم تصوف میں ایک ستون کی حیثیت حاصل ہے جس کے ذریعے "مغز و معنی" تک پہنچا جاتا ہے۔

13۔ ناقابلِ بیان رازوں تک جانے کا راستہ

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا.[1]

صوفیاء نے برسوں سے اپنے مسلک اور مقصد کی ترقی کے لیے جس اہم ترین چیز کا استعمال کیا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں بہت کامیابی ملی ہے، وہ یہی عام سادہ اذہان والے افراد کو بعض ایسے اسرار کا جھانسہ دینا ہے جنہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ان پر کشف ہوئے ہوتے ہیں لیکن دوسروں سے مخفی رہتے ہیں۔ نہ زبان ان کو بیان کرنے کی طاقت رکھتی ہے نہ کان ان کو سن سکتے ہیں۔ لیکن کچھ دل ان کے چھپے رہنے سے پگھل جائیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایسے معاملات ہیں جن کو کوئی اس وقت تک نہیں دیکھے گا جب تک کہ وہ خود ان تک نہ پہنچے اور کوئی نہ سمجھے گا جب تک خود چکھ نہ لے۔ وہ لوگ جو "پہنچے ہوئے" ہیں، وہ بھی لب سی لیں اور کچھ نہ کہیں۔ ان "حقائق" تک پہنچنے کا راستہ علم نہیں ہے۔

واضح ہے کہ اس طرح کے الفاظ سادہ دل افراد کی عقل پر عجیب اثر ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو تجسس کی نعمت عطا کی ہے اس کی وجہ سے یہ لوگ اس نامعلوم مقصد کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پروپیگنڈہ اس نشہ آور محلول کی مانند ہے جو حق کے پیاسے لوگوں کے دماغوں پر ڈالا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اس مسلک پر عمل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تھکا دینے والی اور سخت ریاضتیں کرنے کو بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف وہ اسی بات کو بڑے بڑے اہلِ علم کو بدنام کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں اور ان کو حقائق کو نہ سمجھنے والا، ان سے ناواقف اور پوشیدہ رازوں سے دور رہنے والا قرار دیتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی بھی مذمت کرتے ہیں جنہوں نے دینی معارف کے حصول میں کئی سالوں تک بہت زیادہ تکلیفیں جھیلیں اور توحید اور قیامت سے لے کر اخلاقیات اور فقہ کی مختلف شاخوں میں مہارت حاصل کرنے کیلئے قرآن کی آیات اور اہل بیت عصمتؑ کی احادیث پر بحث اور غور و فکر کی اور عمل کی دنیا میں بھی ایک مقام پیدا کیا ہے۔ وہ انکی ان تھک کوششوں کو ہلکا پھلکا سمجھتے ہیں اور انہیں قشری مولوی یا اہلِ ظاہر یا اہلِ قیل و قال وغیرہ کہتے ہیں۔ جبکہ وہ خود، جیسا کہ ان کے اپنے الفاظ اور تحریریں گواہی دیتی ہیں، ابھی تک کائنات کو سمجھنے کے ابتدائی مراحل سے نہیں گزرے ہیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اہلِ لُب، اہلِ مغز، اہلِ معنی اور اہل ذوق و حال سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سطح سے بھی اوپر جاتے ہیں اور اپنے آپ کو قوی روحوں کا مربی قرار دیتے ہیں اور بڑے بڑے دانشوروں کو کمزور عقلوں کا استاد قرار دیتے ہیں۔

اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ علمی اور سائنسی تحقیق کی حیثیت کو کم کرنے کے لیے وہ اس مشہور حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ: "علم تعلیم اور مطالعہ کی کثرت میں نہیں ہے، بلکہ ایک نور ہے جسے اللہ تعالیٰ جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے"۔[2] وہ کہتے ہیں کہ یہ پڑھنا لکھنا انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا۔ لیکن یہاں دو نکات قابلِ غور ہیں:

1: فرض کریں کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ علم کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے انسان کو تعلیم و تعلم چھوڑ کر خانقاہ کے گوشے میں بیٹھ کر ذکر کرنا چاہیے یہاں تک کہ عالم غیب کا علم پرندے کی طرح اڑ کر اس کے دل میں آجائے، تو کیا ہم اس حدیث کو ان تمام آیات اور احادیث کو رد کرنے

---

[1] سورہ یوسف، آیت 83۔ ترجمہ: "بلکہ تم نے خود اپنی طرف سے ایک بات بنالی ہے۔"

[2] منیۃ المرید، جلد 1، صفحہ 167

کے لیے استعمال کر سکتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنے اور لکھنے پڑھنے پر تاکید کرتی ہیں اور اس کو نجات اور سعادت کا راستہ قرار دیتی ہیں؟ اگر تعلیم و تعلم سچائیوں کو کشف کرنے کا ذریعہ نہیں ہے تو پھر قرآن و حدیث میں علم پر مباحثہ کرنے، سائنسی مسائل پر گفتگو اور غور و فکر کرنے، پڑھے لکھوں کی محفل میں حاضر ہونے، علم کو لکھنے اور اسے لوگوں میں پھیلانے پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ کیا آپ نے بارہا نہیں سنا کہ مسلکِ جعفری کے عظیم رہنما امام جعفر صادقؑ کی مجلسِ درس بہت بڑی ہوتی تھی اور ان کے شاگردوں کی کل تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اگر تعلیم و تعلم حق تک پہنچنے کا راستہ نہیں تھا تو امامؑ نے اس طریقہ کو بدل کر طلباء کے ساتھ خانقاہوں کے پیروں جیسا سلوک کیوں نہ کیا؟ اس عظیم شخصیت نے اس مجلس میں صرف احکام ہی بیان نہیں کیے بلکہ اس درس میں ہر قسم کے دینی و علمی، عقلی و نقلی مسائل پر بحث کی۔ احادیث سے سروکار رکھنے والے اس بات کی تصدیق کریں گے۔

2: اگر تعلیم و تعلم سے دل میں علم کی شمع روشن نہیں ہوتی تو خانقاہوں میں برسوں گزارنے والے لوگ سائنسی مسائل، توحید اور معاد سے متعلقہ مفاہیم کی معرفت، قرآن کریم کی تفسیر اور اہل بیتؑ کی احادیث کو سمجھنے میں اس قدر عاجز کیوں ہیں؟ یہ یونانی اصطلاحات کا کھیل نہیں ہیں جن کے بارے میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اصطلاحات سے سروکار نہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شیخ صفی الدین یا حسین بن منصور حلاج کی باتیں خواجہ طوسی، علامہ حلی، علامہ مجلسی، سید مرتضیٰ اور شیخ انصاری وغیرہ سے موازنے کے قابل نہیں؟ اب ان کی کتابیں اٹھائیں... اور ان کا مطالعہ کریں اور خود فیصلہ کریں۔ اگر اتفاق سے صوفیوں میں کچھ مذہبی اور علمی اطلاعات رکھنے والے لوگ ہیں، جیسے غزالی، تو اس کی وجہ یہی رسمی تعلیم ہے۔

عقل و عشق کی بحث میں ثابت ہو جائے گا کہ دانشور اور پڑھے لکھے لوگ ہی علمی نتائج حاصل کر سکتے ہیں اور علم اور اس کی روحانیت کے فوائد سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کے دل علم کی روشنی سے منور ہو جائیں گے اگر وہ علم کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور تہذیب اخلاق کو بھی اپنائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث مبارکہ سے یہی مراد ہے کہ صرف تعلیم و تعلم سے ہی مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور اخلاقی پاکیزگی میں بھی مشغول رہنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیگر روشنیاں، فیوضات اور برکتیں نازل ہوں۔

جب میں نام نہاد خفیہ علوم اور ناقابل بیان معارف کے بارے میں صوفیوں کی باتوں سے روبرو ہوتا ہوں تو مجھے قدیم کیمیا گر یاد آجاتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ اہم نہیں کہ کیمیا گری، یعنی مختلف دھاتوں کو مختلف طریقوں سے سونے میں بدلنا، بنیادی طور پر ایک افسانہ ہے یا حقیقت، اور اگر یہ سچ ہے تو کیا جدید دور میں نیوکلیئر ری ایکٹر سے سونا بنانا چاہیئے یا نہیں، تاہم ہم اتنا جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں دھوکہ بازوں اور علمی فریب کاروں کے ایک گروہ نے کیمیا، لیمیا، سیمیا اور ریمیا کے ناموں سے بیوقوف اور لالچی سرمایہ داروں کو دھوکہ دے کر بغیر کسی محنت اور مشقت کے اس قیمتی سرخ دھات کو بنانے اور بڑی دولت حاصل کرنے کی امید دلائی اور بھٹی میں دھوئیں اور آگ کا تماشا لگا کر نہ صرف امیر لوگوں کی دولت ہتھیائی بلکہ غریبوں کے مال میں سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا لے لیا۔ یوں ان کی زندگی بھر کی کمائی ان بھٹیوں میں جھونک کر ان کو خالی ہاتھ اور خستہ بدن کے ساتھ واپس لوٹا دیا۔

بلاشبہ، بیدار اور سمجھدار لوگ کیمیاسازی کی ہوس اور کیمیا گروں کے دھوکے میں گرفتار نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے دولت کے حصول کے صحیح راستے، یعنی کام، صنعت، کاروبار اور تجارت پر قدم بڑھائے۔ ان مشکل راستوں کو ترک نہیں کیا۔ خاص طور پر ایسا اسلئے ہوا کہ انہوں نے اس مشاہدے سے سبق سیکھا تھا کہ فریب کاروں کے پیچھے چلنے والوں کو سوائے افسوس اور ناکامی کے کچھ نہیں ملتا۔

ان واقعات سے عبرت لینی چاہیے اور ان وعدوں پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے اور بغیر کسی دلیل اور گفتگو کے اپنے آپ کو کسی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ بالفرض آپ ایسے افراد کے افعال اور عقائد کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کرسکے ہوں پھر بھی ایسے عجیب وغریب روحانی مقامات اور درجات تک رسائی کیلئے کہ جن کے بارے میں یہ کہا جارہا ہو کہ ان پر پہنچے بنا ان کے بارے میں جاننا ممکن نہیں، محض امید اور حسنِ ظن کی بنیاد پر کسی کی پیروی کرنا درست نہیں ہے۔ اپنے عقائد وافکار کی عنان چھپے رازوں کے جاننے کے دعوے کرنے والوں کے سپرد نہیں کرنی چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات معقول نہیں ہے کہ کوئی عقلمند اور باشعور آدمی اس صاف اور سیدھی راہ کو چھوڑ کر جس پر چلنے والے کی کامیابی سے سب آگاہ ہوں ایسے راستے پر نہیں جائے گا جو تاریک اور پر پیچ وخم ہو، جس پر بعض بدنام قسم کے لوگوں کو رہنما بنانا پڑے اور وہاں خفیہ اور پراسرار چیزوں کے بارے میں اسے کوئی خبر نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ معرفت الٰہی اور علم وعرفان کی روشنی حاصل کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہے کہ معصومینؑ کی ہدایت کی روشنی میں علم حاصل کیا جائے اور اس کے ساتھ نفس کا تزکیہ کیا جائے اور ہوا وہوس کو ترک کیا جائے۔ ہم کیوں اس روشن چراغ کو چھوڑ کر ان فریب کاروں کی پیروی میں اندھیروں میں چلے جائیں؟وَ لَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا.[1] ،ترجمہ:"اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے بازپرس ہوگی۔"

[1] سورہ اسراء، آیت 36۔

باب دوم: عقل اور عشق

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَۃٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ مَثۡنٰی وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا۔[1]

یقیناً اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اس کی سعادت اور بھلائی کے ارادے سے کی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے دو اہم نعمتیں عطا کی ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے: ایک عقل کی طاقت (critical thinking) اور دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ انبیاءؑ کو مبعوث کرنا۔ ان دونوں نعمتوں کے مکمل ہو جانے کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا اور اس کے لیے جو بھی مایوسی اور ناکامی پیدا ہوتی ہے وہ اس کی اپنی ذات سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ موحدین کے مولا حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ان للہ علی الناس حجتین حجة ظاهره و حجة باطنه فاما الظاهرة فالرسل و الانبیا و اما الباطنة فالعقول۔[2] ترجمہ: "لوگوں پر خدا کی دو حجتیں ہیں، ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ ظاہری حجت نبی اور پیغمبر ہیں اور باطنی حجت عقلیں ہیں۔" بعض اوقات عقل کو باطنی رسول بھی کہا گیا ہے جس طرح انبیاء کو بھی ظاہری عقل کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ دونوں ایک ہی مقصد اور منزل کی طرف چلتے ہیں۔

دریں اثنا، انسانی جسم و جاں میں جبلت اور فطرت کی قوتیں بھی ہیں، جن کا مقصد دو سابقہ قوتوں کی تکمیل اور ان کی پشتیبانی کرنا ہے۔ یہ جبلتیں بہت ہیں اور شاید ان سب کو شمار کرنا مشکل ہو گا۔ جیسے فائدہ حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کی جبلت، یعنی شہوت اور غضب، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان غرائز میں سے ہر ایک میں زیادتی یا کمی بے شمار مفاسد کا سبب بنتی ہے، جن کے بیان اور ان سے بچنے کے طریقے بتانا علمِ اخلاق کے دائرے میں آتا ہے۔ حد سے زیادہ محبت، یعنی عشق، ان جبلتوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے جس کا ہر فرد کی تقدیر پر گہرا اثر پڑتا ہے اور ہر فرد کی خوشی اور غم کا براہ راست تعلق اس سے ہوتا ہے۔

یہاں ہمارا مقصد لفظ عشق (passion) اور اس کے مصدر اور اصل پر بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ اس لغوی بحث سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جس چیز پر ہم بحث کر رہے ہیں وہ اس کا وہی مفہوم ہے جسے کبھی بے حد محبت، کبھی شدید لگاؤ اور کبھی عشق یا شدید احساسات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[3] بنی نوع

---

[1] سورہ سباء، آیت 46۔ ترجمہ: "کہہ دیجئے: میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہو، ایک ایک اور دو دو کر کے، پھر سوچو۔"

[2] اصولِ کافی، جلد 1، صفحہ 16۔

[3] عرضِ مترجم: قرآن کریم میں آیا ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ وَ لَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ۔ (سورہ بقرہ، آیت 165۔)

ترجمہ: "اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل قرار دیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے اور ایمان والے تو سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم لوگ عذاب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد جو کچھ سمجھنے والے ہیں اب سمجھ لیتے کہ ساری طاقتیں صرف اللہ ہی کی ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں نہایت شدید ہے۔"

انسان کی تاریخ میں اس جبلت نے شاندار کام کیے ہیں اور اسی وجہ سے یہ ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ لیکن کسی بھی صورت میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محبت اور عشق عقل کا بازو ہے اور اس کا مقصد عظیم کام کرنا ہے۔ ہاں یہ بازو کی طرح ہے۔ عقل انسان کو درکار لازمی آگاہی دیتی ہے اور عشق اسے آگاہی کی راہ پر چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر عشق عقل سے الگ ہو جائے تو یہ جنون اور تباہی کا باعث ہے۔

لیکن صوفیاء کا خیال ہے کہ یہ مظہر سلطنتِ نفس کا بادشاہ ہے اور عقل اس کی کٹھ پتلی ہے! بلکہ وہ عقل کو اس سے کمتر سمجھتے ہیں کہ وہ ان بلندیوں کی طرف پرواز کرے جہاں عشق کا ہما جاتا ہے۔ بعض اوقات انہوں نے آگے بڑھ کر عقل کو راہِ حق کا راہزن کہا اور اسے اسرار الٰہی کے خلوت خانے میں اجنبی قرار دیا۔ اس کے برعکس وہ عشق کو خفیہ رازوں اور ناقابل بیان اسرار کا محرم سمجھتے ہیں۔ اس عقیدے کے اثرات ان کے ہاں نظم اور نثر دونوں طرح کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات بعض ایسے لوگوں کے کلام میں بھی آئی ہے جو پر سوز عرفانی افکار میں دلچسپی تو رکھتے ہیں مگر وہ صوفی نہیں ہیں۔ حافظ شیرازی کا کہنا ہے:

در ازل پر تو حسنت ز تجلی دم زد	عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد
عقل می خواست کز آن شعلہ چراغ افروزد	برق غیرت بدرخشید و جہان برہم زد
مدعی خواست کہ آید بہ تماشا گہ راز	دست غیب آمد بر سینہ نامحرم زد

ہلالی کا کہنا ہے:

جہان یک قطرہ از دریای عشق است	فلک یک سبزہ از صحرای عشق است
چراغ بی زوال آفرینش	فروغ گوہر یکتای عشق است
اگر روح است اگر عقل است اگر دل	شرار آتش سودای عشق است!

ایک اور شاعر کا شعر ہے:

آزمودم عقل دور اندیش را	بعد ازاین دیوانہ سازم خویش را

ایک اور مقام پر کہتا ہے:

عقل راہم آزمودم من بسی	زین سپس جویم جنون رامغرسی

ایک اور شاعر کا کہنا ہے:

باعاقلان بگو کہ ارباب ذوق را	عشق است رہنمانہ اندیشہ رہبر است

اس خیال کے ایک اور طرفدار کا کہنا ہے:

ورای طاعت دیوانگان زما طلب	کہ شیخ مذہب ماعاقلی گنہ دانست

منطق الطیر میں شیخ عطار کہتا ہے:

عشق جانان آتش است و عقل ودود	عشق کآمد در گریزد عقل زود

بالآخر حافظ شیرازی یوں کام تمام کرتا ہے:

مارا بہ منع عقل مترسان و می بیار | کین شحنہ در ولایت ما ہیچ کارہ نیست

"دانشنامہ" کا مصنف اس خیال کو پسند کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عقل اور عشق کے بارے میں سب سے بہترین مثال وہ ہے جو آخری شعر میں آئی ہے، یعنی عشق سلطان کی طرح ہے اور عقل ایک چوکیدار کی طرح ہے۔ بہر حال صوفیاء نے اس اصول سے بہت سے نتائج اخذ کیے ہیں اور در حقیقت اسے اپنے مسلک کی بنیادوں میں سے ایک قرار دیا ہے اور اس پر تصوف کا ایک خیالی محل تعمیر کر لیا ہے۔ ظاہر ہے جب پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تھی تو یہ ٹیڑھا پن اوپر تک چلا گیا ہے۔ اس اصول کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جلوۂ حق کے متلاشی اور سالک کو چاہیے کہ وہ عقلی دلائل پر اپنے کانوں کو بند کر لے اور حقائق کی دریافت کیلئے عقل کو اپنا سہارا نہ بنائے اور اس "لکڑی کی ٹانگ" کو اس راستے پر اپنا سہارا نہ بنائے۔ رومی، جو اس گروہ کا فصیح نمائندہ ہے، کہتا ہے:

پای استدلالیان چوبین بود | پای چوبین سخت بی تمکین بود

عقل کی اس تحقیر اور عشق کے بارے غلو کرنے کے کیا نتائج نکلے، یہ آپ اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔

1۔ علوم اور دانش کے خلاف جنگ!

اس عقل دشمنی کی بنیاد پر بہت سے صوفی پیروں نے حقیقی حصولی علوم اور کتابوں اور کاپیوں کی کھل کر مخالفت کی۔ وہ علوم کے دشمن اور سخت مخالف تھے۔ وہ اعلانیہ طور پر اکتسابی اور استدلالی علوم سے جڑی ہر چیز سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ بعض نے اس مسئلہ پر اس حد تک اصرار کیا ہے کہ ان کے حالات کا مطالعہ کسی بھی قاری کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کر دے گا۔ کچھ لوگوں کیلئے شاید یہ ماننا مشکل ہو کہ کوئی اس طرح بھی علم اور دانش کی مخالفت کر سکتا ہے؟[1] اس مخالفت اور دشمنی کی چند مثالیں ہم ڈاکٹر قاسم غنی کی کتاب تاریخِ تصوف سے یہاں پیش کرتے ہیں:

---

[1] عرضِ مترجم: نام نہاد عارفوں کے بہت سے نظریات سائنس کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر شہاب الدین سہروردی اور ملا صدرا وغیرہ نے ایٹم کا انکار کیا، جبکہ جدید فزکس اور کیمسٹری کا علم اسی نظریئے پر استوار ہے۔ (شرح حکمۃ الاشراق سہروردی، صفحہ 233، قاعدہ فی ابطال الجوہر الفرد، تہران؛ اسفار اربعہ، جلد 2، صفحہ 94، بیروت۔) یہ لوگ اتفاقات کے وقوع پذیر ہونے کے قائل بھی نہ تھے۔ (اسفار اربعہ، جلد 2، صفحات 253 تا 256 بیروت۔) جبکہ جدید دور میں ڈیٹا سائنس بہت اہمیت اختیار کر چکی ہے جس میں اتفاقی واقعات کے گوناگوں رجحانات کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صوفیا روشنی کی ترکیب کو بھی نہ سمجھ سکے اور اس سے ذات باری پر قیاس کرتے رہے۔ اکثر نام ہاد عرفاء نے زمین کو ساکن قرار دیا اور سورج کے گرد سیاروں کی گردش کا انکار کیا۔ کششِ ثقل (gravity) سے بھی یہ لوگ ناواقف تھے۔ (اسفار اربعہ، جلد 3، صفحہ 217، بیروت۔)

اسی طرح انہوں نے خارجی قوتوں کے بجائے جوہری تحرک کو اشیاء کی حرکت کا سبب بتایا، جو کہ نیوٹن کی تحقیقات سے باطل ثابت ہوا۔ مختلف بیماریوں کے علاج کے معاملے میں بھی جدید علمِ طب نے نام نہاد عرفا کے کئی اقوال کو باطل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح ذہنِ انسانی کے بارے جدید علمِ نفسیات کی تحقیقات ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ صوفیاء نفسیات کے رازوں سے آشنا نہیں اور ان کے طریقے لوگوں کو نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں۔ سماجی علوم، جیسے معیشت اور ریاستی اختیارات کی تقسیم جیسے مسائل پر تو ماضی کے صوفیاء بالکل خاموش ہیں۔ ان کا لوگوں سے تبادلہ خیال نہ کر سکنا ان کو سماجی معاملات میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کے تعین سے محروم رکھتا ہے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

1: جنید بغدادی، جو شیخ سری کا شاگرد اور صوفیوں کا ایک بڑا بزرگ تھا، اسکا عقیدہ یہ تھا کہ: پڑھنا اور لکھنا صوفی کی فکر کی پراکندگی کا سبب ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بہتر ہے یہ کہا جائے کہ پڑھنے لکھنے سے انسان آگاہ اور بیدار ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے تصوف سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچئے، ہمارے اور ساری دنیا کے پاس جو کچھ ہے وہ پڑھنے لکھنے کی برکت سے ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ کچھ لوگ ان دونوں کو توجہ کے بٹنے کا سبب قرار دیں؟ دوسری اقوام نے بنیادی تعلیم کو لازمی قرار دینا شروع کر دیا ہے لیکن یہاں کچھ لوگ ہمیں جنید بغدادی کی خرافات سنا رہے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر لوگ اس بات پر عمل کریں تو معاشرہ جہالت کے دور کی طرف لوٹ جائے گا؟

2: شیخ عطار نے بشر حافی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس کے پاس حدیث کی کتابوں کے سات صندوق تھے، اس نے ان سب کو زمین کے نیچے دفن کر دیا اور روایت نہ کیا۔[1]

3: شبلی کہا کرتا تھا: میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو تصوف میں اس وقت تک داخل نہیں ہوا جب تک کہ اس نے اپنا سارا مال خرچ نہ کر دیا اور اس نے اپنی لکھی ہوئی کتابوں کے ستر صندوق دریائے دجلہ میں ڈال دیئے۔ یہ شخص شبلی خود تھا![2]

احمد بن ابی الحواری جو ایک بڑا پیر ہے، اس نے بھی اپنی کتابیں سمندر میں پھینک دیں اور کہا: نعم الدلیل انت، والاشتغال بالدلیل بعد الوصول محال، یعنی ہاں تم بہت اچھا چراغِ راہ ہو لیکن حق تک پہنچنے کے بعد دلیل سے سروکار رکھنا محال ہے۔ یہ واقعہ کتاب تاریخ تصوف میں احمد بن ابی الحواری سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن بعض دوسرے لوگوں نے اسی قسم کی بات ابو سعید سے بھی منسوب کی ہے جس نے اپنی کتابیں زمین میں دفن کرنے کے بعد یہی سب کہا۔[3] ابو سعید سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ اس نے کہا: رأس ہذا الامر کبس المحابر و خرق الدفاتر و نسیان العلوم، یعنی اس کام کی ابتدا قلم و دوات کو چھپانا، نوٹ بکس جلانا اور علوم بھول جانا ہے۔[4] شیخ فرید الدین عطار نے

غرض تصوف ایک ایسا جہلِ مرکب (pseudoscience) ہے جس نے صدیوں تک مسلمانوں کے انسانی سرمائے (human resource) کو حقیقی علم سے دور رکھا اور استعماری قبضے کی راہ ہموار کی۔ قرآن جا بجا سائنسی تحقیق کا حکم دیتا ہے، جیسے: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ.(سورہ یونس، آیت 101۔) ترجمہ: "کہہ دیجئے: آسمانوں اور زمین میں نظر ڈالو کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں۔" اور: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ.(سورہ فصلت، آیت 53۔) ترجمہ: "ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں اور خود ان کی ذات میں بھی دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقیناً وہی حق ہے۔" کائنات، سماجی مظاہر اور اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے انسان یہ جان سکتا ہے کہ یہ سبھی عبادت کے لائق نہیں اور معبودِ حقیقی وہی خالق ہے جو اپنی مخلوق کی صفات سے پاک اور منزہ ہے اور جس کی پہچان کیلئے انسان قرآن و عترت کا محتاج ہے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مختلف موجودات پر غور کرنے کے بعد اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! جن چیزوں کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ (سورہ انعام، آیت 78۔) اسی طرح اپنی حقیر خواہشاتِ نفس کو معبود بنانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ (سورہ جاثیہ، آیت 23۔) یہی وہ معرفتِ نفس ہے جو معرفتِ خدا میں مددگار ہے۔ صوفیوں نے معرفتِ نفس کے عنوان سے جو لکھا ہے وہ درست نہیں ہے۔

[1] تذکرۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 108۔

[2] ڈاکٹر غنی، تاریخِ تصوف، صفحہ 514۔

[3] تذکرۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 260۔

[4] اسرار التوحید، صفحات 32، 33۔

یوسف بن حسین رازی کی سوانح عمری میں لکھا ہے: جب ذوالنون مصری (اس کے مرشد) نے اسے مصر چھوڑنے اور اپنے شہر واپس جانے کا حکم دیا تو یوسف نے ذوالنون سے دستور العمل مانگا۔ ذوالنون مصری نے کہا: جو کچھ تم نے پڑھا ہے اسے بھول جاؤ اور جو کچھ تم نے لکھا ہے اسے دھو ڈالو یہاں تک کہ پردہ اٹھ جائے۔[1] مصنف کہتے ہیں: یہ ہر چیز پر فاتحہ پڑھنے کا کتنا مختصر اور تیر بہدف نسخہ ہے!

مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ اسلام کی تعلیمات اور اس مقدس دین کے پیشواؤں کی ہدایات سے کس حد تک دور تھے۔ ان کا کردار اور طرز عمل بالکل ان لوگوں جیسا ہے جو اسلام کے دینی ماحول میں پرورش نہ پائے ہوں اور قرآن کے چشمے سے ایک قطرہ بھی نہ پیا ہو۔ وہ اس کوشش میں رہے کہ کاپیاں پھاڑ دیں اور کتابوں کے صندوق پانی میں ڈبو دیں یا مٹی میں دبا دیں۔ یوں احادیث کی کتابوں کو سمندر کی مچھلیوں یا مٹی کی دیمک کے حوالے کر دیں۔ اس کے برعکس اسلام کے پیشواؤں نے کتابوں کی حفاظت اور پیغمبر اکرمؐ اور آئمۂ اطہارؑ کے فرمودات کو محفوظ کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ بطورِ مثال:

1: علامہ مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار میں حضور اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: من حفظ علی امتی اربعین حدیثا ینتفعون بها فی امر دینهم بعثه الله یوم القیمة فقیها عالما.[2] ترجمہ": جس نے میری امت کے لیے چالیس احادیث حفظ کیں اور انہیں ان تک پہنچایا تاکہ وہ اپنے دینی امور میں ان سے استفادہ کریں، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن فقیہ اور عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا۔"

البتہ حفظ کا مطلب کسی بھی طریقے سے حفاظت کرنا ہے۔ جیسا کہ بزرگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ انہیں یاد کیا جائے، لکھ دیا جائے یا دوسروں سے لکھوا لیا جائے۔ یہ حدیث شیعوں اور سنیوں میں مشہور احادیث میں سے ہے اور سنی و شیعہ علماء نے اپنی کتابوں میں اس مضمون پر کئی احادیث نقل کی ہیں۔ درحقیقت بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث تواتر کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ اس حدیث اور اس سے ملتی جلتی احادیث کی وجہ سے علمائے اسلام نے ہمیشہ احادیث کی حفاظت اور نگہداری میں بڑی محنت صرف کی اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بعض نے اس روایت کے مواد پر مکمل عمل کرنے کے لیے اربعین یا چہل حدیث کے عنوان سے بھی کتابیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اگرچہ ہم اس محترم مقام کے مستحق نہیں ہیں لیکن ہمیں بہت خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس چھوٹی سی کتاب میں بھی چالیس احادیث بیان کرنے کا اعزاز عطا کیا ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ.[3] خدا کی قسم! کہاں اسلام کا یہ حکم اور کتابوں کے ستر صندوق دریا میں پھینکنا کہاں؟ شاید اگر وہ کتابیں تلف نہ ہوتیں اور ہم تک پہنچ جاتیں تو آج ہم ان کے ذریعے اپنے بہت سے دینی و دنیاوی مسائل حل کر چکے ہوتے۔ خدا اس جہالت اور حماقت کے گھر کو تباہ کرے!

---

[1] تذکرۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 318۔

[2] بحار الانوار، جلد 2، صفحات 153 تا 156؛ کنز العمال، جلد 18، صفحہ 130۔

[3] سورہ جمعہ، آیت 4۔

2:امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ:زکوۃ الید البذل والعطاء والسخاء بما انعم اللہ علیک بہ و تحریکہا بکتبہ العلوم و منافع ینتفع بہا المسلمون.[1]، ترجمہ:"ہاتھ کی زکات جود و بخشش اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ کو عطا کیا ہے اس میں سخاوت کرنا ہے۔ نیز علوم کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں پر خرچ کرنا ہے۔"

3:امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب سے کہا:احتفظوا بکتبکم فانکم سوف تحتاجون الیہا.[2]، ترجمہ:"اپنی کتابیں سنبھال لو، کیونکہ جلد ہی تمہیں ان کی ضرورت ہوگی۔"

4:امام جعفر صادقؑ نے مفضل بن عمر سے فرمایا:اکتب و بث علمک فی اخوانک فان مت فورث کتبک بنیک فانہ یاتی علی الناس زمان ہرج ما یانسون فیہا الا بکتبہم.[3]، ترجمہ:"اپنا علم لکھو اور اپنے بھائیوں میں پھیلادو، اور اگر تم مرنے لگو تو اپنے بیٹوں کیلئے ورثے میں یہ کتابیں چھوڑو۔ کیونکہ آنے والا زمانہ سخت ہوگا جس میں لوگوں کی تنہا مخلص دوست کتاب ہوگی۔" یہ معجزاتی حدیث اور اس جیسی حدیثیں اس بات کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں کہ آئمہ ہدیؑ کی احادیث اور آثار کو محفوظ رکھنا کتنا ضروری ہے۔ یہ حدیث یہ حکم دیتی ہے کہ احادیث معصومینؑ کو ہر قیمت پر سنبھال کر مسلمانوں کی آنے والی نسلوں تک پہنچایا جائے۔ ان مقدس احکامات کی روشنی میں ہم مسلمانوں کو ہمیشہ علوم کی حمایت کرنے اور انہیں پھیلانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔

2۔ قرآن کو ترک کرنے کی تعلیم

ابو سعید ابو الخیر سے روایت ہے کہ اس نے کہا کہ جب ہم پر کوئی نفسیاتی کیفیت طاری ہو جاتی تو ہم اپنی کتابوں اور نوٹ بکس میں سکون نہیں پاتے تھے۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے کچھ ذہنی سکون دے۔ خدا نے مجھ پر کرم کیا اور میں نے اپنی کتابوں سے دوری کر لی اور قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہو گیا۔ سورہ فاتحہ سے میں نے پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ میں سورہ انعام کی اس آیت تک پہنچ گیا: ثُمَّ ذَرۡہُمۡ فِیۡ خَوۡضِہِمۡ یَلۡعَبُوۡنَ.[4] ترجمہ:"پھر انہیں ان کی بیہودگیوں میں کھیلتے چھوڑ دیں۔" یہاں آکر میں نے کتاب رکھ دی۔ جتنی بھی کوشش کی اس سے آگے ایک آیت بھی نہ پڑھ سکا۔ پس اس کو بھی ایک کونے میں رکھ دیا۔[5] مصنف کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سورہ کہف میں فرماتا ہے:قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا. اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا.[6]، ترجمہ:"کہہ دیجئے:

---

[1] سفینۃ البحار، جلد 2، صفحہ 461۔

[2] اصول کافی، جلد 1، صفحہ 73، حدیث 10۔

[3] اصول کافی، جلد 1، باب روایۃ الکتب والحدیث، حدیث 11۔

[4] سورہ انعام، آیت 91۔

[5] اسرار التوحید، صفحہ 33، تہران۔

[6] سورہ کہف، آیات 103، 104۔

کیا ہم تمہیں بتا دیں کہ کاموں کے اعتبار سے سب سے نامراد کون لوگ ہیں؟ جن کی سعی دنیاوی زندگی میں لاحاصل رہی جب کہ وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ درست کام کر رہے ہیں۔"

علامہ مجلسی بحار الانوار میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی ابن موسیٰ رضاؑ ہر تین دن میں ایک مرتبہ قرآن مجید کو ختم کیا کرتے تھے۔[1] اسی کتاب میں آگے چل کر امام سجادؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے افضل اعمال کے بارے میں زہری کے سوال کے جواب میں فرمایا: "بہترین عمل یہ ہے کہ قرآن کو ابتدا سے پڑھنا شروع کر کے اسے ختم کیا جائے اور یہ عمل دہرایا جائے۔"[2] محترم قارئین، آپ کی رائے میں کیا ہمیں اسلام کے عظیم راہنماؤں کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے یا ابوسعید ابوالخیر کی بات سننی چاہیے؟ ان لوگوں نے کن ہدایات کے مطابق عمل کیا اور کس پیغمبر اور امام کی پیروی کی؟ کیا آپ ہمیں یہ حق دیتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کے بارے میں کہیں: اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَہۡوَی الۡاَنۡفُسُ.[3] ترجمہ: "یہ لوگ صرف گمان اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔" اگر ہم قرآن، اس کی تلاوت اور اس پر غور و فکر کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے بات کرنا چاہیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم اصل موضوع سے ہٹ جائیں، لیکن اس مقصد کیلئے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ ہے وہ قرآن کی وجہ سے ہے اور حقیقی روحانیت اور دل کی پاکیزگی حاصل کرنے اور ذکرِ الٰہی میں رہنے کا بہترین طریقہ قرآن کی آیات کی تلاوت اور ان پر غور و فکر ہے، یہ چند احادیث پیش کرنا کافی ہو گا:

1: شیخ صدوق اپنی کتاب امالی میں ایک مفصل حدیث میں رسول اللہؐ سے نقل کرتے ہیں کہ: من قرا عشر آیات فی لیلة لم یکتب من الغافلین. ترجمہ" : جو شخص رات کو قرآن مجید کی دس آیات پڑھے گا وہ غافلوں میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ "

2: اسی کتاب میں رسول اللہؐ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں: نوروا بیوتکم بتلاوة القرآن. ترجمہ: "قرآن کی تلاوت سے اپنے گھروں کو منور کرو۔"

3: نہج البلاغہ میں موحدین کے مولا حضرت علیؑ سے قرآن کے بارے میں متعدد خطبات نقل ہوئے ہیں جن میں سے ایک جملہ نقل کرنا کافی ہو گا: فیه ربیع القلب و ینابیع العلم و ما للقلب جلاء غیره. ترجمہ: "اسی میں دل کی بہار اور علم کے سرچشمے ہیں اور اسی سے آئینۂ قلب پر جلا ہوتی ہے۔"[4]

اس عظیم ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ روح کو تقویت دینے، عقل کو پختہ کرنے اور شیطان کے وسوسوں سے نجات کا واحد راستہ قرآن مجید کی آیات پر غور و فکر کرنا ہے۔ اس لیے وہ تاریک اور پتھریلے راستے جنہیں صوفیوں نے اپنے لیے چنا ہے وہ ناکامی کے سوا کسی انجام تک نہیں پہنچائیں گے۔ اس بات کو ہم اس معنی خیز حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ بحار الانوار میں عیون اخبار الرضا کے حوالے سے روایت ہے کہ امام علی رضاؑ نے فرمایا:

---

[1] بحار الانوار، جلد 92، صفحہ 204۔

[2] بحار الانوار، جلد 92، صفحہ 204۔

[3] سورہ نجم، آیت 23۔

[4] نہج البلاغہ، خطبہ 174، ترجمہ: مفتی جعفر حسینؒ

يا ابن أبي محمود إذا أخذ الناس يمينا وشمالا فألزم طريقتنا فإنه من لزمنا لزمناه، ومن فارقنا فارقناه، إن أدنى ما يخرج الرجل من الإيمان أن يقول للحصاة: هذه نواة ثم يدين بذلك ويبرأ ممن خالفه، يا ابن أبي محمود احفظ ما حدثتك به فقد جمعت لك فيه خير الدنيا والآخرة.[1] ترجمہ: "اے ابن ابی محمود! جب لوگ راہ راست سے ہٹ کر دائیں اور بائیں طرف مائل ہوں گے تو تم ہمارے راستے پر قائم رہنا۔ کیونکہ جو ہمارے ساتھ رہے گا ہم اس کے ساتھ رہیں گے اور جو ہم سے جدا ہو گا ہم اس سے جدا ہو جائیں گے۔ کم سے کم چیز جو انسان کو ایمان سے دور کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کنکری سے کہے یہ مغز ہے۔ پھر وہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے۔ جو میں نے تجھ سے کہا ہے اس پر عمل کر کیونکہ میں نے تیرے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں اسی میں جمع کر رکھی ہیں۔" اس حدیث مبارکہ میں سیکھنے کیلئے بہت کچھ ہے لیکن یہاں اس پر مفصل بحث کی جگہ نہیں ہے۔

3۔ عقلی اور نقلی علوم کو ترک کرنے کی تاکید

جامی نے نفحات الانس میں عین الزمان جمال الدین گیلی کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ شیخ نجم الدین کبری کے خلفاء میں سے تھا اور بہت عالم و فاضل تھا۔ شروع میں جب اس نے شیخ کی مجلس میں جانے کا فیصلہ کیا تو وہ اپنے کتب خانے گیا اور عقلی اور نقلی علوم کے ایک ذخیرے کو منتخب کیا تاکہ سفر میں اپنے ساتھ رکھے۔ جب وہ خوارزم کے قریب پہنچا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ شیخ نے اسے کہا: "اے گیلانی! اپنا بوجھ پھینک کر آجاؤ۔" جب وہ بیدار ہوا تو اس نے سوچا کہ بوجھ کیا ہوتا ہے۔ میرے پاس دنیا سے کچھ نہیں ہے اور مجھے اسے جمع کرنے کا کوئی خیال بھی نہیں ہے۔ دوسری رات اس نے پھر وہی خواب دیکھا۔ تیسری رات اس نے شیخ سے پوچھا کہ اے میرے شیخ! بوجھ کیا ہے؟ اس نے کہا یہ وہ کتب کا ذخیرہ ہے جو تم نے جمع کیا ہے۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے اسے دریا میں پھینک دیا۔ جب یہ شیخ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ اگر تم وہ ذخیرہ نہ پھینکتے تو تمہیں کچھ فائدہ نہ ہوتا۔[2]

مصنف کا کہنا ہے کہ ہم نے آج تک جو کچھ دیکھا اور سنا ہے وہ یہ ہے کہ نجات اور رستگاری کا راستہ نقلی اور عقلی علوم پر عمل کرنے میں ہے۔ رسول اللہؐ سے نقل شدہ مشہور حدیثِ ثقلین کو سنی اور شیعہ محدثین نے بیان کیا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔[3] اس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم خدا پرستی اور دائمی سعادت کے راستے سے بھٹکنا نہیں چاہتے تو دو قیمتی چیزوں کو تھام لو جو میں تمہارے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑ رہا ہوں: قرآن اور میری عترت۔ یہ حدیث کہاں اور شیخ نجم الدین کی بات کہاں کہ اگر نقلی و عقلی علوم کا "بوجھ" نہ پھینکتے تو تمہیں کچھ فائدہ نہ ہوتا؟!

4۔ پڑھائی عیب کیسے؟

مشہور صوفیاء میں سے ایک ابو سعید الکندی ایک خانقاہ میں درویشوں کے درمیان رہتا تھا اور کبھی چپکے سے مدرسے میں بھی چلا جاتا تھا۔ ایک دن خانقاہ میں اس کی دوات اس کی جیب سے گر گئی اور اس کا راز کھل گیا! کچھ صوفیوں نے اس سے کہا: اپنی شرمگاہ چھپا لو![4] ایک دن شبلی نے حسین بن

---

[1] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 115۔

[2] تاریخ تصوف در ایران، صفحہ 514۔

[3] اصولِ کافی، جلد 1، صفحہ 294؛ سنن نسائی جلد 5، صفحہ 45؛ سنن ترمذی، جلد 2، صفحہ 307؛ وغیرہ۔

[4] نقد العلم والعلماء، صفحہ 317۔

احمد صفار کے ہاتھ میں دوات دیکھی تو اس سے کہا: اپنی سیاہی مجھ سے دور لے جاؤ، کیونکہ میرے لیے میرے دل کی سیاہی کافی ہے![1] مصنف کہتا ہے: وہ گروہ جو دوات اور روشنائی کو شرمگاہ سمجھتا ہے اور ان کے ہاں تعلیم حاصل کرنا عیب اور ننگ ہے، ان سے خیر اور بھلائی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ اب اس بیان کا مسلک امامیہ کے عظیم رہنما امام جعفر صادقؑ کے قول سے موازنہ کریں جسے علامہ مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار میں نقل کیا ہے: إذا كانَ يَومُ القِيامَةِ جَمَعَ اللهُ عَزَّ و جلَّ النّاسَ فِي صَعيدٍ واحِدٍ، و وُضِعَتِ المَوازينُ، فيُوزَنُ دِماءُ الشُّهَداءِ مَعَ مِدادِ العُلَماءِ، فيَرجَحُ مِدادُ العُلَماءِ عَلى دِماءِ الشُّهَداءِ.[2] ترجمہ: "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک جگہ جمع کرے گا۔ شہداء کا خون ترازو کے ایک پلڑے میں اور علماء کی دواتوں کو دوسرے پلڑے میں رکھے گا۔ وہ پلڑا جس میں علماء کی دواتوں کا اجر ہو گا وہ نیچے ہو جائے گا۔"

یہ عقل، عشق، عقلی دلائل، نقلی علوم اور اکتسابی علوم کے بارے میں بڑے صوفیاء کے عقائد اور آراء کی ایک جھلک تھی۔ یہ ہے ان کا مبلغ علم!

5۔ حضرتِ شیخ جو پکڑے گئے میخانے میں!

ماضی کے کئی قصے بیان کرنے کے بعد ایک معاصر صوفی لکھاری لکھتا ہے: "ان سب باتوں کے باوجود ان الفاظ کے سیاق و سباق سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ صوفی اساساً علم و دانش اور کتاب کے مخالف تھے یا نوٹ بک اور قلم و دوات کے دشمن تھے۔"[3] ایسی توجیہات گھڑنے والے لوگوں سے کہنا چاہیے: ان کی علم و دانش کی مخالفت ان کے کلام میں صراحت سے آئی ہے۔ یہ نصِ کلام اور متن کا حصہ ہے۔ یہ ایسی بات نہیں جسے استنباط کیا گیا ہو۔ لیلیٰ کے حسن و جمال کے ان تمام قصوں کے بعد اب آپ کہتے ہیں کہ کوئی یہ تصور نہ کرے کہ لیلیٰ ایک خاتون تھی۔ واقعی عجیب بات ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جو فارسی میں محاورتاً مشہور ہے کہ کسی شخص کو شارک مچھلی کہہ کر کہا جائے کہ اس کی اچھی چوڑی داڑھی بھی ہے!

جب بھی ہم انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ طریقہ جو صوفیوں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے وہ کسی صحیح معیار کے مطابق نہیں ہے۔ سب سے پہلے ہم اس مسئلے کو قرآن کریم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس عظیم آسمانی کتاب سے فیصلہ چاہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

1: قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا.[4] ترجمہ: "کہہ دیجئے: میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہو، ایک ایک اور دو دو کر کے، پھر سوچو۔"

خدا نے حضورؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ جھگڑالو لوگوں اور مخالفین کی بے بنیاد باتوں کے جواب میں ایک ہی چیز کی دعوت دیں جو درحقیقت تمام اچھائیوں کی جڑ اور کامیابی کی بنیاد ہے اور جس سے حقیقت کا راستہ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ کہہ دیجئے: میں تمہیں صرف ایک چیز کی نصیحت کرتا ہوں،

---

[1] ارزش میراث صوفیہ، صفحہ 161۔

[2] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 16۔

[3] ڈاکٹر قاسم غنی، تاریخِ تصوف، صفحہ 515۔

[4] سورہ سبا، آیت 46۔

اور وہ یہ ہے کہ خدا کے لیے انفرادی یا اجتماعی طور پر اٹھو اور غور و فکر کرو۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ نجات اور کامیابی کا واحد راستہ سوچنا اور فکر سے کام لینا ہے۔

2: كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.[1] ترجمہ: ”یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبانِ عقل اس سے نصیحت حاصل کریں۔“ لہٰذا اس آسمانی مقدس کتاب کو مرتب کرنے اور اسے حضور نبی اکرمؐ کے پاس بھیجنے کا اصل مقصد عقلمندوں کو غور و فکر، تدبر اور عقل و فہم کی دعوت دینا ہے اور یہی وہ سب سے بڑا اعزاز اور فضیلت ہے جو عقل کو عطا کی گئی ہے۔

3: قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۗ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.[2] ترجمہ: ”کہہ دیجئے: کیا پڑھے لکھے اور ان پڑھ برابر ہو سکتے ہیں؟ بے شک نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔“ اس مبارک آیت میں اللہ تعالیٰ نے آیات کے معانی کو سمجھنے اور تذکر کو عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے مخصوص کیا ہے اور دوسری جگہ فرمایا ہے: وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.[3] ترجمہ: ”اور نصیحت تو صرف عقل مند ہی قبول کرتے ہیں“۔ اس آیت سے بھی اسی مفہوم کا اظہار ہوتا ہے اور یہی وہ عظیم ترین مقام ہے جو عقل و فکر کے لیے ان آیات سے ثابت ہے۔

4: فَبَشِّرۡ عِبَادِ. الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدٰٮهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.[4] ترجمہ ” : میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے، جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔“ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور عقل کو ایک دوسرے کے قریب قرار دیا ہے اور اپنے مخلص اور خاص بندوں کی ان دو صفات سے تعریف کی ہے۔ اس بیان سے عقل کے مقام کی اہمیت بخوبی نمایاں ہوتی ہے۔

5: فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ ۛۚ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۛۚ قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكُمۡ ذِكۡرًا.[5] ترجمہ ” : پس اے عقل مند ایماندارو! اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کیا ہے“۔ اس آیت میں بھی صاحبانِ عقل کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے لیے جو اعلیٰ ترین کمال قابلِ تصور ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ صراحتاً بیان ہوا ہے کہ ہر شخص کے کردار اور مرتبے کا پیمانہ اس کا تقویٰ ہے:

---

[1] سورہ ص، آیت 29۔

[2] سورہ زمر، آیت 9۔

[3] سورہ آل عمران، آیت 7۔

[4] سورہ زمر، آیات 17،18۔

[5] سورہ طلاق، آیت 10۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ.[1] ترجمہ: "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہیں قومیں اور قبیلے بنادیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک یقیناً وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔ اللہ یقینا خوب جاننے والا، باخبر ہے"۔ اور چونکہ پچھلی آیت میں تقویٰ کے درجے کے حصول کے بارے میں سخت حکم دیا گیا تھا اور عقل والوں کو مخاطب کیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کی بنیاد اور اساس "عقل" ہے۔ توجہ فرمائیں!

6:اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ.[2] ترجمہ: "بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں صاحبانِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔"

آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن اور رات کے تغیر میں عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے خدا کی عظمت و وحدانیت کی دلیلیں اور نشانیاں ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ توحید کے رازوں کو سمجھنا اور خالق کائنات کی عظمت کو سمجھنا ہی سعادت و فلاح کا ذریعہ ہے اور ایمان، تقویٰ اور دیگر انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد واضح طور پر عقل پر رکھی گئی ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے عقل ہی ان تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہوگا۔ کیا عقل کو بیگانہ اور اجنبی، بلکہ خدا کی راہ کا راہزن سمجھنا درست ہے؟

7:قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.[3] ترجمہ: "آپ کہیے: اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔"

حضور کو اہل کتاب کے ان بے بنیاد دعووں کے جواب میں یہ کہنے کا حکم دیا گیا جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ جنت میں صرف وہی داخل ہوں گے۔ اس مبارک آیت میں خدا نے حق و صداقت کی دلیل کو برہان اور منطق قرار دیا ہے اور بے دلیل دعووں کی بے اعتباری کا اعلان کیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی دہرائی گئی ہے، سورہ الانبیاء آیت نمبر 24 میں ارشاد ہے: اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۚ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ. ترجمہ: "کیا انہوں نے اللہ کے سوا معبود بنالیے ہیں؟ کہہ دیجئے: تم اپنی دلیل پیش کرو۔" سورہ نمل آیت نمبر 64 میں ہے: ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. ترجمہ: "کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہہ دیجئے: اپنی دلیل پیش کرو اگر تم لوگ سچے ہو۔"

مختصر یہ کہ قرآن کا طریقہ اور روش یہ ہے کہ ہر معاملے میں ثبوت اور دلائل کا مطالبہ کیا جائے اور خود قرآن نے اس طریقے کو حقائق کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے اور اپنے مطالب کو عقل کی ٹھوس بنیاد پر قائم کیا ہے۔ جو کوئی بھی قرآن کا مطالعہ کرتا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جو عقل اور علم کی بنیاد پر بات نہیں کرتے۔ اسلام نے کبھی ایسے الفاظ کا سہارا نہیں لیا کہ "اس راستے پر چلو

---

[1] سورہ حجرات، آیت 13۔

[2] سورہ آل عمران، آیت 190۔

[3] سورہ بقرہ، آیت 111۔

گے تو ہی دیکھ پاؤ گے۔ کھاؤ گے تو ہی چکھ پاؤ گے۔ "[1]ہم نے ہمیشہ اس مسئلے پر دنیا کے سامنے فخر کیا ہے اور اپنے آپ کو منطق و استدلال کے پیروکاروں کے طور پر متعارف کرایا ہے اور بے بنیاد دعووں سے خود کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں کتابیں لکھی ہیں اور اپنے

---

[1] **اسلام میں عقل کی اہمیت:** اسلام باقی مذاہب اور معاشرتی نظاموں سے زیادہ عقل کو اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے دین اسلام کی بنیاد کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ حدیث نبوی ہے:العقل اساس دینی،عقل میرے دین کی بنیاد ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے جو لوگ عقل کی نعمت سے بالکل محروم ہیں، جیسے پاگل اور دیوانے، وہ مکلف نہیں ہوتے۔ اسلام کے قوانین اور حقوق و فرائض کیلئے کتاب و سنت اور اجماع کے علاوہ عقل بھی ایک مآخذ ہے۔ اعتقادات کا منبع بھی عقل ہے۔ فقہاء اور دین کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اعتقادی اصولوں کی کلیات کی بنیاد عقلی استدلال پر ہونی چاہیے۔ بہت سی آیاتِ قرآنی عقل کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں اور انسانوں کو بار بار عقلی روش کا پابند ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ عقل کو انسان اور حیوان میں فرق قرار دیا گیا ہے۔ ان آیات کی مختلف اقسام ہیں:

1: کائنات میں تعقل کرنے کی دعوت اور سائنسی قوانین کی ہم آہنگی پر غور، جو خدا کے ہونے کی دلیل مانی جاتی ہے، جیسے:وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ۙ وَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ.(سورہ نحل، آیت 12۔) ترجمہ:"اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں، عقل سے کام لینے والوں کے لیے ان چیزوں میں یقیناً نشانیاں ہیں"۔

قرآن لوگوں کو عقلی اور فکری استقلال اور خودی عطا کرتا ہے اور یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ سب معاملات میں اپنی عقل سے کام لیں۔ خوب اور بد کو پہچانیں۔ چنانچہ مختلف مقامات پر انسان کو اپنی عقل کو کام میں لانے اور کائنات کے اسرار کو جاننے کی دعوت دیتا ہے۔ متعدد مقامات پر افلا تعقلون،لعلکم تفکرون،افلا یتذکرون،افلا یتدبرون،فانظروا،وغیرہ جیسے الفاظ آئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کو مخلوقات میں تفکر و تدبر کی دعوت دیتے ہیں۔

ان آیات کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں جو نماز، زکوٰۃ، عدل و احسان، جہاد اور حصولِ علم جیسے اعمال صالحہ کے فوائد بیان کرتی ہیں اور برے کاموں جیسے قتل، شراب، زنا، جھوٹ اور خیانت کے نقصانات کو بیان کرتی ہیں۔ ان سب میں قرآن لوگوں کے ذہنوں اور افکار کو کھولنا اور انہیں اچھائی اور برائی کی سمجھ دلانا چاہتا ہے۔

2: بعض آیات اس انسان کی ندامت کی عکاسی کرتی ہیں جو بے عقلی کی وجہ سے آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔ مثلاً وَ قَالُوۡا لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ.(سورہ ملک، آیت 10۔) ترجمہ:"اور وہ کہیں گے:اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمیوں میں نہ ہوتے۔"

3: قرآن ایسے لوگوں کے گروہ کو ملامت کرتا ہے جو عقل کی مدد سے سمجھ گئے ہیں لیکن پھر بھی حق کو چھپاتے ہیں اور عقل کی راہ سے جان بوجھ کر ہٹ جاتے ہیں :یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ.(سورہ بقرہ، آیت 75۔) ترجمہ:"اللہ کا کلام سنتے ہیں، پھر اسے سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔"

4: قرآن کریم نے ان لوگوں سے "انسان" کا درجہ چھین لیا ہے جو اپنی فکر اور عقل کو استعمال نہیں کرتے اور ان کا تذکرہ حیوانات میں سے پست ترین حیوانوں کے طور پر کیا ہے۔ مثلاً:اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الۡبُکۡمُ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ.(سورہ انفال، آیت 22۔) ترجمہ:"اللہ کے نزدیک تمام حیوانوں میں بدترین یقیناً وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"داؤد الہامی

تمام عقائد کو عقل سے ثابت کیا ہے اور دلائل و براہین سے مخالفین کے منہ بند کیے ہیں۔ ہم اس شاعر کے الفاظ جیسے کمزور الفاظ سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے:

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست　　　سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجاست

ہم نے کبھی ان مکڑی کے جالوں کو نہیں تھاما، لیکن بدقسمتی سے صوفی برادری اس طریقے کے بالکل برعکس چلتی ہے۔

6۔ میر داماد اور قطب الدین

آخر میں عقل و برہان کی اہمیت پر میر داماد کے کچھ اشعار پیش کرنا مناسب رہے گا۔ نیز ایک صوفی پیر سید قطب الدین تبریزی نے اس کے جواب میں جو اشعار کہے ہیں ان کو بھی نقل کر کے پھر ان پر ایک تبصرہ کریں گے۔ میر داماد کی اشعار رومی کے اس مشہور شعر کے جواب میں ہیں:

پای استدلالیان چوبین بود　　　پای چوبین سخت بی تمکین بود

گر کسی از عقل با تمکین بدی　　　فخر رازی راز دار دین بدی!

میر داماد اس کے جواب میں کہتے ہیں:

ای کہ گفتی پای چوبین شد دلیل　　　ور نہ بودی فخر رازی بی دلیل

فہم نا کردہ میان عقل و وہم　　　طعنہ بر برہان مزن ای کج بفہم

ہست در تحقیق برہان اوستاد　　　دادہ خاک خرمن شبہت بباد

در کتاب حق اولو الالباب بین　　　وان تدبر را کہ کردہ آفرین

ز آہن تثبیت فیاض مبین　　　پای استدلال کردم آہنین

سید قطب الدین تبریزی کہتا ہے کہ جب اس نے ان اشعار کو کتاب قبسات کی پشت پر دیکھا تو اس کی غیرت جاگ اٹھی اور ان کے جواب میں اس نے کہا:

بشنوید ای سالکان از من جواب　　　کان بود در نہج حق فصل الخطاب

ای کہ طعنہ می زنی بر مولوی　　　ای کہ محرومی ز فیض مثنوی

گر تو فہم مثنوی می داشتی　　　کی زبان طعنہ می افراشتی

گرچہ ستیہای استدلال عقل　　　مولوی در مثنوی کردہ نقل

لیک مقصودش نبودہ عقل کل　　　زانکہ او ہادیست در کل سبل

بلکہ قصدش عقل جزئی فلسفی است　　　ز آنکہ بی نور حسن یوسفی است

یہ اشعار مرزا بابای ذہبی کی تصنیف طباشیر الحکمہ، صفحہ 106، سے نقل کیے گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ سید قطب الدین تبریزی کہتا ہے: اولوا الالباب سے اللہ تعالیٰ نے جو مراد لیا ہے وہ صرف عقلِ کل ہے اور یہ مخلوقات کی عام عقلوں سے مختلف ہے۔ بلکہ وہ مغز کی طرح ہے اور لوگوں کی عقل چھلکے کی طرح ہے۔ اب عقل کل سے صوفیوں کی مراد حضورؐ ہوں یا کچھ اور، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ بات کئی پہلوؤں سے ناقابل قبول ہے۔

1: جو بھی عربی زبان سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ اولوالالباب سے مراد عقل و فکر کے مالک لوگ ہیں اور اس میں کوئی جزئی یا کلی کا فرق نہیں ہے۔ قرآن کریم نے کہیں بھی اسے عقلِ کل تک محدود نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اولوالالباب کو عقلِ کل سے تعبیر کرنے کا کوئی مدرک یا سند نہیں ہے، اور یہ تفسیر رائے پر مبنی ہے۔

2: اللہ تعالیٰ نے خود اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ اولوالالباب کون ہیں؟ سورہ زمر کی آیت نمبر 18 میں فرمایا: الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ[1]۔، ترجمہ" : جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔ "

سورہ آل عمران کی آیت نمبر 190 میں فرمایا: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔[2] ترجمہ: "بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں صاحبانِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ "

پھر اگلی آیت میں اولوالالباب کی یہ صفات بیان ہوئی ہیں: الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔[3] ترجمہ: "جو اُٹھتے بیٹھتے اور اپنی کروٹوں پر لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں، (اور کہتے ہیں:) ہمارے رب! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا، تیری ذات (ہر عبث سے) پاک ہے، پس ہمیں عذاب جہنم سے بچالے۔"

یہ خود قرآن پر مبنی ایک واضح تفسیر ہے۔

3: اگر ہم سابقہ آیات پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اولوالالباب کے الفاظ میں تمام اہل حق کی طرف خطاب ہے اور ہاتوا برہانکم کے الفاظ مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے کہے گئے ہیں۔ اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اولوالالباب کا معنی عقلِ کل ہے جبکہ قرآن دوست اور دشمن دونوں کو دلیل کی پیروی کرنے کے لئے کہتا ہے؟ کیا یہ اپنی رائے سے من پسند تفسیر کرنا نہیں جس کی مذمت آئی ہے؟

ضمناً اسلئے کہ غیرت کے جوش میں قطب الدین تبریزی نے جو اشعار کہے تھے وہ بے جواب نہ رہیں، مصنف نے یہ اشعار کہے ہیں:

سالکا! این نکتہ را می دار گوش	از کلام غیرِ حق، چشمت بپوش!
گر کہ ہستی سالک راہ صواب	اندکی آہستہ تر، کم کن شتاب
سالک آن نبوَد کہ بر مردان حق	می زند از روی غیرت طعن و دق
جوششِ غیرت، لجاج است و عناد	این لجاجت بر کسی سودی نداد
سالک آن نبود کہ بی چون و چرا	می شود با ہر صدایی ہم صدا

[1] سورہ زمر، آیت 18۔

[2] سورہ آل عمران، آیت 190۔

[3] سورہ آل عمران، آیت 191۔

زنگِ خودبینی، زِقلبت دور کن — چشمِ دل از حرف حق، پرُ نور کن
لوح دل را از تعصب پاک کن — جامہ تقلید بر تن چاک کن
حق اگر خواہی بسان آفتاب — بشنو از قرآن کہ شد فصل الخطاب
عقل را بستودہ در قرآن، بَسی — حق تدبر خواستہ از ہر کسی
حق، نمودہ مدحِ برہان بی شمار — صدق را دانستہ بر آن استوار
نیست در قرآن سخن از عقلِ کل — نی سخن از ہادی کل سبل
او او لوا الالباب را شرح و بیان — کردہ خواہی سورہ عمران بخوان
بشنو این گفتار می ترس از خدا — تا نبندی بر خدا ایت افترا

یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ہم اس عقل، استدلال اور علم کی تعریف کرتے ہیں جو قرآن اور راہ حق کے راہنماؤں کے ارشادات کی روشنی میں پروان چڑھی ہے۔ اس بحث کو ہم چند ایک پاک احادیث پر ختم کریں گے۔

1: شیخ کلینی نے اپنی کتاب اصول کافی میں عقل و جہل کے باب میں عقل کے مقام اور اس کی اہمیت کی تعریف میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک میں وہ امیر المومنین حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جبرائیلؑ حضرت آدمؑ کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپؑ کو تین چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا کہوں تا کہ آپؑ جس کو چاہیں چن لیں۔ آدمؑ نے کہا وہ تین چیزیں کون سی ہیں؟ جبرائیلؑ نے کہا: عقل، حیا اور دین۔ آدمؑ نے کہا: میں عقل کا انتخاب کرتا ہوں۔ جبرائیلؑ نے حیا اور دین کو عقل کو چھوڑ کر واپس جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم عقل کے ساتھ رہیں اور اس سے الگ نہ ہوں۔ آپؑ نے فرمایا: اپنی ذمہ داری پوری کرو، اور آسمان کی طرف چلے گئے۔[1]

تھوڑی دیر کے لیے اس حدیث پر غور کریں اور دیکھیں کہ کس طرح عقل کو باقی دو خوبیوں یعنی حیا اور دین کا مطلق حاکم مانا جاتا ہے اور انہیں عقل کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ دین ایسی تعلیمات کا مجموعہ ہے جو انسان کی معاشرتی زندگی کا نظام قائم رکھنے اور دنیا و آخرت کی سعادت کو یقینی بنانے کا ذمہ دار ہے۔ ان تعلیمات کا ایک سرا توحید جیسے عقائد اور دوسری سرا چھوٹے سے چھوٹے فقہی اور اخلاقی احکام سے جا ملتا ہے۔ حیا وہ صفت ہے جو جس کسی میں ہو اسے دوسروں کے حقوق کی حفاظت، تمام افراد کے ساتھ حسن سلوک اور بزرگوں کے احترام کو برقرار رکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ جب حیا اور دین جیسی یہ دو نمایاں صفات عقل کے تابع ہوں اور اس کے ماتحت ہوں تو عقل کی اہمیت کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

حیرت ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کے مصنف نے اگرچہ خود یہ حدیث مبارکہ اپنی کتاب میں بیان کی ہے، لیکن جب وہ عقل و عشق کی بحث میں داخل ہوتا ہے تو صوفیوں کا جو بیان ہم نے نقل کیا ہے، اسے پسند کرتا ہے اور عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے، اور عشق کو غالب اور عقل کو مغلوب سمجھتا ہے۔ اگر مراد خدا سے عشق ہے، جو کہ دین اور ایمان کا نچوڑ ہے، تو وہ عقل کو مغلوب اور محبت کو غالب کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا مذکورہ بالا حدیث سے یہ واضح نہیں ہوا کہ دین اور ایمان کو عقل کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مذکورہ مصنف نے اس معاملے کو سلجھانے کے لیے ایک

---

[1] اصولِ کافی، جلد 1، صفحہ 10۔

مثال دی ہے جو اصل بات سے زیادہ بری ہے۔ وہ عشق کو ایک شہوت پرست نوجوان سے تشبیہ دیتا ہے، جس کے پاس ایک بہت ہی خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکی بیٹھی ہے۔ وہ عقل کو ایک افسردہ بوڑھے آدمی سے تشبیہ دیتا ہے جو ان سے کچھ دور بیٹھا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: "یقیناً اس بوڑھے کی باتوں کا ایسے نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہوگا اور اس کی بات پر نوجوان کے جذبات غالب آئیں گے۔" لیکن یہ بات ان لوگوں کے بارے میں کہی جانی چاہیے جن کی ذہنی قوت اس بوڑھے کی جسمانی قوت کی طرح ختم ہو چکی ہو اور ان کی جبلتیں بے قابو ہو گئی ہوں۔ گویا انتخاب کی طاقت عقل سے چھین لی گئی ہو۔ اس مثال کا تربیت شدہ عقل سے کیا تعلق ہے جو ایمان کے لیے ضروری ہے اور اس کی ساتھی اور رفیق ہے اور اس سے ہم آہنگ ہے؟

2: مرحوم احمد بن محمد بن خالد برقی، جو عظیم شیعہ راویوں میں سے ہیں، کتاب محاسن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ: ما قسم الله للعباد شيئاً افضل من العقل.[1]، ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عقل سے بہتر کوئی چیز نہیں دی ہے۔" اس روایت سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ لوگوں کی عقلیں خدا کا اعلیٰ ترین تحفہ ہیں اور ان کی عزت ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔

3: شیخ کلینی نے کافی میں امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ان الثواب على قدر عقل.[2] ترجمہ: "ثواب کی مقدار عقل کے تناسب سے ہے۔" شیخ صدوق نے بھی اپنی کتاب امالی میں امام جعفر صادقؑ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اس روایت سے اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ اعمال کے اجر و ثواب کا انحصار اعمال کی مقدار پر نہیں ہوتا بلکہ عقل و فکر کے معیار پر ہوتا ہے۔

4: نہج البلاغہ کے آخر میں امام علی ابن ابی طالبؑ سے منقول مختصر کلمات میں آپؑ نے بارہا عقل کے بلند و بالا مقام کی ستائش کی اور اسے انسان کا سب سے بڑا سرمایہ، دولت اور بے نیازی کا سب سے اہم ذریعہ قرار دیا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جسم کی مملکت کی حاکمیت عشق اور جبلت کے سپرد کی گئی ہے وہ حقیقت میں عقل اور عشق دونوں کے مقام سے ناواقف ہیں۔ اس مملکت میں عقلی طاقت کا فرض بالکل وہی ہے جو دنیا کے ممالک میں پارلیمنٹ کا ہے۔ یعنی جبلتوں کی طرف سے انسان کی مادی اور روحانی زندگی سے متعلق منصوبے اور مطالبات عقل کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ عقل پوری ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ان کے بارے میں گہرائی سے سوچتی ہے اور جو اس مملکت کے مفادات کیلئے بہتر ہوں انہیں قبول اور باقیوں کو مسترد کرتی ہے۔ پھر عقل جسمانی طاقتوں اور جبلتوں کو منظور شدہ منصوبوں پر عمل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ عشق (passion) اس کا انتظامی بازو ہے۔ جس طرح ہر وہ ملک جس کا قانون ساز ادارہ زیادہ باخبر ہے وہ خوشی اور بھلائی کے زیادہ قریب ہے، اسی طرح ہر وہ انسان جس کا علم زیادہ ہے اور جس کی عقل قوی اور خواہشات کی دستبرد سے محفوظ ہے، وہ سعادت مند رہے گا۔ لہٰذا جس طرح انتظامیہ کا قانون سازی کو اپنے ہاتھ میں لینا محال ہے، اسی طرح جبلتیں بھی عقل کی جگہ نہیں لے سکتیں اور جسم کی مملکت پر حکومت نہیں کر سکتیں۔ دوسرے الفاظ میں: عقل ہر جبلت کی حدود کا محافظ ہے اور اس کے توازن کو برقرار رکھنے رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ ایمان اور عشق اگرچہ قیمتی اور گراں ہیں لیکن ایک سنجیدہ فوجی افسر کی طرح ہیں جسے ہمیشہ اپنے کمانڈر، یعنی عقل، کا حکم سننا چاہیے۔

---

[1] اصول کافی، جلد 1، صفحہ 12۔

[2] کافی، جلد 1، صفحہ 12۔

7۔ دو اہم نکات

اس مقام پر جہاں عقل اور عشق کی بحث اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے تو دو نکات کی یاددہانی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

1: انسان کی کامیابی کے محل کی بنیادیں

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انسانی سعادت کا واحد راستہ عقل اور فکر کی طاقت کو استعمال کرنا ہے اور سچائیوں تک پہنچنے کے لیے انسان کے ہاتھ میں اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ کشف اور شہود کی بحث میں یہ واضح ہو جائے گا کہ خیالی کشفیات کے ذریعے حقائق کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل اور فکری غلطیوں سے دور رہنے کے لیے ضروری ہے کہ نقلی علوم سے مدد لی جائے اور ان کی روشنی میں نجات اور حقیقت کا راستہ تلاش کیا جائے۔ دوسری طرف تقویٰ اور تزکیہ نفس کے ذریعے عقل و فکر کے آئینے کو چمکانے کی ضرورت بھی ہے تا کہ اس آئینے میں سچائیوں کو ان کی حقیقی شکل میں دیکھا جاسکے۔ عظیم علماء اور ماہرین تعلیم نے طلبہ کے آداب کے موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں اس حصے کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس لیے انسانی سعادت کا محل درحقیقت تین ستونوں پر بنایا گیا ہے:

1: وہ علوم جو منبعِ نبوت اور ولایت سے منتقل ہوئے ہیں،

2: عقل اور فکر کی طاقت کا استعمال،

3: تقویٰ اور پرہیزگاری اور روح کو پاک کرنا۔

اس موضوع پر شاید بہترین مثال جو دی جاسکتی ہے یہ ہے کہ عقل اور فکر آنکھ کی مانند ہیں اور منتقل شدہ علوم روشنی کی طرح ہیں اور تقویٰ فضا کے شفاف ہونے اور گرد و غبار سے پاک ہونے کا نام ہے۔ جن لوگوں کی آنکھیں سلامت ہوں اور وہ اشیاء کو اپنی آنکھوں کے سامنے روشنی میں رکھتے ہیں اور ان کے ارد گرد کی ہوا دھوئیں اور دھول سے پاک ہے، انہیں صاف نظر آتا ہے۔ لیکن جو لوگ عقل کی طاقت سے محروم ہیں یا اگر ان کے پاس ہے تو وہ اسے استعمال نہیں کرتے، وہ اندھوں یا نابینا افراد کی طرح ہیں کیونکہ ان کو تیز روشنی اور صاف ہوا کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا‌ ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَ لٰكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ[1]. ترجمہ: "کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے دل عقل والے یا ان کے کان سننے والے ہو جاتے؟ حقیقتاً آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔"

کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی ہے تا کہ درست سوچ سکیں یا سنی گئی باتوں پر توجہ دے سکیں؟ انکا اندھا پن آنکھوں کا اندھا ہونا نہیں ہے بلکہ یہ عقل کھو بیٹھے ہیں۔ جو لوگ صرف عقل کی طاقت اور استدلال کے زور سے سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور منتقل شدہ علوم پر توجہ نہیں دیتے وہ ایسے شخص کی طرح ہیں جو اندھیرے میں گھورتا ہے لیکن وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔

---

[1] سورہ حج، آیت 46۔

قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ. يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَ يَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ.[1] ، ترجمہ: ”بتحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو امن و سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور وہ اپنے اذن سے انہیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور انہیں راہ راست کی رہنمائی فرماتا ہے۔ “

وَ مَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ.[2]، ترجمہ: ”جسے اللہ نور نہ دے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں۔ “

جن کے پاس یہ دو چیزیں ہیں لیکن عمل اور تزکیۂ نفس کی کمی ہے اور عقلی اور فکری صلاحیتوں پر ان کی جبلت کے تسلط کی وجہ سے عقل کی آنکھ کے گرد ایک غیر موزوں اور غبار آلود ماحول پیدا ہو گیا ہے، وہ بھی بہت سی حقیقتوں کو سمجھنے سے دور رہتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّكُمۡ فُرۡقَانًا.[3]، ترجمہ: ”اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہیں درست و غلط میں تمیز کرنے کی طاقت عطا کرے گا۔ “

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اہلِ عقل پر بعض اعتراضات کا جواب بھی ضمنی طور پر واضح ہو گیا ہے، مثلاً رومی اپنی مشہور نظم میں کہتا ہے:

گر کسی از عقل با تمکین بدی　　　فخر رازی راز دار دین بدی

در حقیقت اس نے اس بات سے غفلت کی ہے کہ فخر الرازی اگرچہ ایک عالم، دانشمند اور مفکر آدمی تھا، لیکن وہ ضدی، متعصب اور متکبر بھی تھا۔ اس نے اپنے وقت کا بڑا حصہ شکوک و شبہات اور اعتراضات اٹھانے میں صرف کیا، یہاں تک کہ وہ امام المشککین کہلایا جانے لگا۔ ان صفت کے ساتھ عقلمند انسان کے لیے استدلال کی طاقت سے حقائق کا ادراک ناممکن ہے، کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے ضد اور تعصب کا گھنا پردہ اس کے ذہن کو سچائیوں کے سمجھنے سے روکتا ہے۔

2: عقل کی صلاحیت کی حد

انسان کا دماغ اور عقل کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اس کی عقل کے زیر اثر آنے والے معاملات پھر بھی محدود ہیں۔[4] ظاہر ہے کہ اس مسئلے کی کوئی ایک جہت نہیں ہے بلکہ تمام انسانی طاقتیں تمام ممکنات کی طرح محدود ہیں، صرف خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہی لامحدود ہے اور بس!

مثال کے طور پر: انسان اور دوسرے جانوروں کی صلاحیتوں میں سے ایک بصارت کی حس ہے۔ یہ حس جتنی بھی قوی ہو، وہ بہت سی چیزوں کو دیکھنے سے عاجز ہے۔ یعنی ایسی چیزیں ہیں جو یا تو بالکل نظر نہیں آتیں یا اگر نظر آتی ہیں تو اتنی چھوٹی ہیں کہ آنکھ ان کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ لہٰذا

---

[1] سورہ مائدہ، آیات 15،16۔

[2] سورہ نور، آیت 40۔

[3] سورہ انفال، آیت 29۔

[4] Translator’s note: Read “Kant's Account of Reason” in Stanford Encyclopedia of Philosophy: https://plato.stanford.edu/archives/win2017/entries/kant-reason/

ایسے میدانوں میں بھٹکنے سے گریز کرنا چاہیے جو انسانی سوچ کے دائرے سے باہر ہیں اور ان سوالات کو ذہن سے نکال دینا چاہیے جو زندگی کے قیمتی سرمائے کے ضیاع کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دیتے۔ بلکہ ان میں فکر انسان کو خطرناک کھائیوں کی طرف لے جا سکتی ہے۔ خدا کی ذات کی حقیقت، اس کی صفات کے راز، قضا اور قدر کا مسئلہ اور اسی طرح کے دیگر معاملات ایسے ہی ہیں۔

جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے: تفكروا في صفات الله ولا تتفكروا في ذات الله، ترجمہ: "خدا کی صفات کے بارے میں سوچو اور اس کی ذات کے بارے میں مت سوچو۔" البتہ صفات کے بارے میں تفکر سے مراد بھی ان کے راز تک پہنچنے کی کوشش نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات کی طرح اس کی صفات کا علمی احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے: ان الله احتجب عن العقول كما احتجب عن الابصار، ترجمہ: "اللہ تعالیٰ عقلوں سے پوشیدہ ہے جس طرح کہ وہ نظروں سے چھپا ہوا ہے۔" امیر المومنین حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ آپ سے قضا و قدر کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: طريق مظلم لا تسلكوه و بحر عميق فلا تلجوه و سر الله فلا تتكلفوه، ترجمہ: "یہ تاریک راستہ ہے، اس پر مت چلو۔ ایک گہرا سمندر ہے، اس میں داخل نہ ہو۔ یہ اللہ کا راز ہے، اس کو پانے کی ذمہ داری نہ اٹھاؤ۔"

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل عقل کے خلاف بعض دوسرے شکوک و شبہات کا جواب یہ ہے کہ بعض دانشمندوں نے عقل و استدلال کی طاقت سے ایسے معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو انسان کی سمجھ سے باہر ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ غلطیوں اور تناقضات کا شکار ہوئے ہیں اور اس وجہ سے بھی ان پر تنقید اور ان کی سرزنش کی گئی ہے۔ ضروری تھا کہ وہ ایسی وادیوں میں داخل نہ ہوں جو عقلِ انسانی کی پہنچ سے باہر ہیں۔

8۔ ذکر اور فکر

پہلے بیان شدہ اصول پر چلتے ہوئے، یعنی عشق کو عقل پر ترجیح دینا، صوفی لوگ عملاً ذکر کو فکر پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے اذکار پر بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ اگر ان کا کوئی ذکر ان کی اپنی اختراع نہ ہو تو بھی اس کی حدود اور ادائیگی کی کیفیت من گھڑت ہوتی ہے۔ اس طرح کے ذکر کا مدرک اکثر مرشد کا ذوق یا اس کے خواب یا اس کے کسی مرید کا خواب ہوتا ہے!

عجیب بات یہ ہے کہ ہر شخص کا ایک مخصوص ذکر ہوتا ہے جو کہ پیر کی اجازت سے اور مخصوص مواقع پر مخصوص تعداد کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔ بلاشبہ یہ ان آیات اور احادیث کے صریحاً خلاف ہے جو سب لوگوں کو اور اجتماعی طور پر ہر ذکر کی طرف بلاتی ہیں یا خاص طور پر کچھ اذکار، جیسے لا الہ الا اللہ، وغیرہ کی دعوت دیتی ہیں اور اس سلسلے میں ایسی کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔

ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیا پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہارؑ اپنے تمام پیروکاروں کے مہربان روحانی باپ اور اخلاق معلم تھے یا نہیں؟ اگر وہ تھے تو پھر انہوں نے لوگوں کو وہ تعلیمات کیوں نہیں دیں جو صوفیاء کے خیال میں افراد کی تربیت میں پوری طرح مؤثر ہیں؟ کیا ذکر الٰہی کے لیے بھی پیر کی اجازت کی ضرورت ہے؟ کیا لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ کہنا ایسی چیز ہے جو ایک شخص کے مزاج کے مطابق ہے اور دوسرے کے مزاج سے مطابقت نہیں

رکھتی؟ کیا یہ اطوار و حرکات اور نعرہ ہائے مستانہ اور مختلف دھنیں، جو بعض صوفی ذکر کرتے وقت بجاتے ہیں، روحانی ترقی پر کوئی اثر ڈالتے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب میں صوفیاء کیا کہیں گے؟

بنیادی طور پر عبادات کے بارے میں ایسی متعدد احادیث ہم تک پہنچی ہیں جن میں ان کے طریقے اور مقدار میں کسی قسم کی مداخلت کو رد کیا گیا ہے، چاہے وہ مداخلت ایسے الفاظ کی تعداد میں اضافہ ہی کیوں نہ ہو جو کہ بہت اچھے اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے میں ذکر اور اس کے طریقے اور مقدار میں مخصوص کیفیات طے کرنے کی ہمت کیسے کی جاسکتی ہے جب کہ اس بات کا کوئی مدرک نہیں؟ شیخ کلینی نے اپنی کتاب کافی میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اہمیت کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔ ایک باب اللہ عزو جل کو کثرت سے یاد کرنے کے بارے میں ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا وَ لَهُ حَدٌّ يَنْتَهِي إِلَيْهِ إِلَّا الذِّكْرَ فَلَيْسَ لَهُ حَدٌّ يَنْتَهِي إِلَيْهِ فَرَضَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ الْفَرَائِضَ فَمَنْ أَدَّاهُنَّ فَهُوَ حَدُّهُنَّ وَ شَهْرَ رَمَضَانَ فَمَنْ صَامَهُ فَهُوَ حَدُّهُ وَ الْحَجَّ فَمَنْ حَجَّ فَهُوَ حَدُّهُ إِلَّا الذِّكْرَ فَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ لَمْ يَرْضَ مِنْهُ بِالْقَلِيلِ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَهُ حَدّاً يَنْتَهِي إِلَيْهِ ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ: يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْراً كَثِيراً وَ سَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَ أَصِيلًا.[1]، ترجمہ: "کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ختم ہونے کی کوئی حد اور پیمانہ نہ ہو، سوائے ذکر کے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرائض کو واجب قرار دیا ہے، اور جو ان کو انجام تک پہنچاتا ہے، یہ ان کی حد اور انتہا ہے... لیکن اللہ نے اپنے ذکر کی کم یا زیادہ مقدار کو فرض نہیں کیا اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی: اے ایمان والو! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کیا کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو۔ "

شیخ صفی الدین اردبیلی جیسے بعض صوفی پیروں کے کلمات میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ذکر، فکر سے زیادہ عمدہ اور اعلیٰ ہے۔ ان کے ایک مشہور شاگرد نے اپنی ایک کتاب صفوۃ الصفا میں اس کے حالات کی تفصیل لکھی ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت 191، الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا، جو اٹھتے بیٹھتے اور اپنی کروٹوں پر لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، کے ذیل میں اس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس نے فکر پر ذکر کو دو دلائل کی بنا پر افضل جانا ہے:

اول یہ کہ ذکر خدا کی طرف توجہ ہے، لیکن فکر اس کی ذات پاک کے علاوہ دیگر موجودات کے بارے میں ہے، پس فکر غیر خدا کی طرف توجہ ہے۔ (کیونکہ ذاتِ خدا میں فکر جائز نہیں!)

دوم یہ کہ ذکر دل کو پاک کرتا ہے۔ اس لیے جو فکر اس سے پیدا ہو وہی درستی اور سچائی کے قریب تر ہوتی ہے۔ پس ذکر فکر سے افضل ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ذکر اگر فکر سے خالی ہو تو بے فائدہ اور زبان کی حرکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ علامہ مجلسی نے امام علی رضاؑ سے نقل کیا ہے کہ: "عبادت زیادہ نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا نہیں ہے، بلکہ خدا کے کاموں میں بہت غور و فکر کرنا ہے۔" یہ بات ہر ایک صاف اور روشن ذہن کے حامل شخص پر بھی واضح ہے کیونکہ نظام کائنات اور اس کے عجائبات اور شگفت انگیزیوں پر غور کرنے کے نتیجے میں انسان کے ایمان اور علم کی بنیاد

---

[1] کافی، جلد 2، صفحہ 498۔

مضبوط ہوتی ہے اور اس وقت جو ذکر وہ کہے گا وہ سب اخلاص اور معرفت کے کمال سے ہو گا اور یقیناً اس ذکر اور عبادت کا کسی اور چیز سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہج البلاغہ میں امام علیؑ کے کلمات قصار میں یہ جملہ اس بات کو بہترین طور پر بیان کرتا ہے:

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ وَ الظَّمَأُ، وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ وَ الْعَنَاءُ؛ حَبَّذَا نَوْمُ الْأَكْيَاسِ وَ إِفْطَارُهُمْ.[1]، ترجمہ: ”بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزوں کا ثمرہ بھوک پیاس کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور بہت سے عابد شب زندہ دار ایسے ہیں جنہیں عبادت کے نتیجہ میں جاگنے اور زحمت اٹھانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ زیرک و دانا لوگوں کا سونا اور روزہ نہ رکھنا بھی قابلِ ستائش ہوتا ہے۔“

لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ زبان کا ذکر جسم کی طرح ہے اور دماغ کی فکر روح کی طرح ہے تو ہم مبالغہ آرائی نہیں کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ خدا کی یاد چھلکے کی مانند ہے اور خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیوں پر غور و فکر مغز کی طرح ہے تو بھی ہم مبالغہ آرائی نہیں کر رہے ہیں۔ قرآن پاک جو کہ انفرادی اور معاشرتی خوش بختی کا بہترین نسخہ ہے، بار بار لوگوں کو تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے۔

اب ذرا توجہ فرمائیں اور دیکھیں کہ یہ لوگ جو کشف اور شہود کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کا دعویٰ ہے کہ اہل علم جو کچھ ظن کے ذریعے جانتے ہیں، وہ یہ حضرات یقین اور قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں، وہ کس قسم کی سطحی باتوں سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں: شیخ صفی اردبیلی اپنی بات، یعنی ذکر کو فکر پر ترجیح دینا، کو ثابت کرنے کے لیے کہتا ہے کہ ذکر کو فکر پر فضیلت اسلئے حاصل ہے کیونکہ ذکر خدا کی طرف توجہ ہے اور فکر خدا کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف توجہ ہے، اس لیے ذکر کو فکر پر فوقیت حاصل ہے۔ واہ ! کیا وہ آپ کے ہم مسلک لوگ نہیں ہیں جو کہتے ہیں کہ ذکر اور عبادت کے دوران کسی مقدس ہستی کا خیال ذہن میں رکھنا چاہئے اور اسے خدا کی ذات پاک کی طرف اشارہ اور حوالہ بنانا چاہئے؟[2] اگر آپ کہتے ہیں کہ ہم ان کو خدا کی صفات کا کامل مظہر مانتے ہیں اور ان کو یاد کرنا خدا کو یاد کرنا ہے۔ ممکن ہے ہم بھی فکر کے معاملے میں آپ کو یہی سب تاویلات پیش کریں۔ اس مسئلہ پر مناسب مقام پر مزید تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

مزید بر آں، آسمانوں، زمین اور دیگر مخلوقات کے بارے میں سوچنے کا مقصد خالق کو بھول کر ان کے بارے میں سوچنا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ کائنات کے تمام ذرّوں میں ایک خالق کی قدرت اور عظمت کے اثرات کو دیکھ کر اس عظیم خالق کو یاد کیا جائے، اور اس کی طرف محبت، الفت، ایمان اور تعظیم سے لبریز دل کے ساتھ رجوع کیا جائے۔ یہ وہ راستہ ہے جو قرآن کریم نے ہمیں بے شمار آیات میں سکھایا ہے، اور ہر جگہ ربِ کائنات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروانے کے لیے قرآن ہمارا ہاتھ تھام کر دنیا کی تخلیق کی سیر کراتا ہے، اور ہمیں سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

9۔ ذکر کی حقیقت کیا ہے؟

ان سب باتوں سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو خود ذکر کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص یہ جملہ، لا الہ الا اللہ، دہراتا رہے، یا اللہ ہو اللہ ہو کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اس کے منہ سے پانی نکلنے لگ جائے اور سر چکرا جائے۔ بلکہ معصومینؑ کی احادیث کے مطابق، جیسا کہ علامہ مجلسی کی کتاب بحار

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حکمت 145۔

[2] کتاب طباشیر الحکمہ کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔

الانوار میں بیان کی گئی اس روایت کے مطابق، ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی کام کرتے وقت اللہ کو نہ بھولے اور اس کی طرف توجہ کرے تاکہ اگر وہ عمل ناپسندیدہ کاموں میں سے ہو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو تو اسے ترک کردے۔ حدیث کا متن یوں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

یا علی، ثَلاثٌ لا تُطیقُها هذِهِ الامَّةِ: المواساةُ لِلأخِ فی مالِهِ وَ انصافُ النّاسِ مِن نَفسِهِ وَ ذِكرُ اللهِ عَلی كلّ حالٍ وَلَیسَ هُوَ» :سُبحانَ اللهِ وَالحَمدُلِلّهِ وَلا إله إلَّااللّهُ وَاللّهُ اكبَرُ «وَلكن إذا وَرَدَ عَلی ما یحرُمُ عَلَیهِ خافَ اللّه عَزَّوَجَلَّ عِندَهُ وَ تَركه.[1]، ترجمہ" :اے علیؑ تین کام ایسے ہیں جو اس امت کا ہر فرد نہیں کرسکتا: بھائیوں کے لیے مالی مدد؛ لوگوں کو ان کا حق خود سے دینا؛ اور ہر حال میں اللہ کو یاد کرنا۔ تاہم، خدا کو یاد کرنا صرف سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہنا نہیں ہے۔ بلکہ خدا کا ذکر تب ہوتا ہے جب انسان کو کسی حرام کام کا موقع ملتا ہے، تو وہ خدا سے ڈرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے۔"

مرحوم مقدّس قمی نے جامع الشتات میں کہا ہے: اس موضوع پر بہت سی روایات آئمہ معصومینؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ: اگرچہ ذکر اور دعا کے کلمات کی ادائیگی ایک مطلوب چیز ہے لیکن اس کی روح وہی دل کی توجہ خدا کی طرف کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا مطلب تعقل کرنا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر صوفیوں کے سادہ لوح مریدوں نے اپنے شب و روز کا بڑا حصہ اذکار کی تکرار میں گزارنے اور من گھڑت اور متعدد ذہنی الجھنیں پیدا کرنے والے اوراد کو دہرانے کے بجائے کچھ وقت خاموشی سے تفکر و تدبر کیا ہوتا جو علم اور ایمان کی جڑ ہے۔ تاکہ اس وسیلے سے اپنے اندر معرفت اور ایمان کی روح کو تقویت پہنچاتے جو تنہا مایۂ سعادت ہے۔

اِنَّا ہَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا.[2]

---

[1] بحار الانوار، جلد 74، صفحہ 45۔

[2] سورہ دہر، آیت 3۔ ترجمہ: "ہم نے اسے راستے کی ہدایت کردی، خواہ شکر گزار بنے اور خواہ ناشکرا۔"

باب سوم: کشف، شہود اور خواب

صوفیوں کے دعووں میں سے ایک جو ان کے مسلک کا اہم ستون ہے، کشف و شہود اور خواب کا مسئلہ ہے۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ سخت مشقتوں کے نتیجے میں ممکن ہے سالک اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اس کے لیے غیب کے دروازے کھل جائیں اور اسے ما فوق الفطرت حقائق اپنی آنکھوں سے دکھائی دیں۔ بلکہ شیخ صفی الدین اردبیلی کے الفاظ میں وہ خدا کے جمال کو خداداد نگاہوں سے دیکھ لیتا ہے۔[1] ان میں سے کچھ اس معاملے میں اتنے بڑھ گئے ہیں کہ جو کوئی ان کی باتوں کو سنتا ہے وہ سخت حیران ہوتا ہے اور اپنے آپ سے کہتا ہے: کیا یہ شخص انسان ہے جو اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا ہے؟ محی الدین ابن عربی اور بایزید بسطامی وغیرہ تو ایک قدم آگے بڑھے ہیں اور معراج تک کا دعویٰ کیا ہے! اگرچہ اس قسم کے دعوے شروع میں بہت پر کشش اور دلچسپ لگتے ہیں اور حق کے متلاشی لوگوں کے جذبات کو ابھارتے ہیں، تاکہ وہ بیچارے پانی کی امید میں سراب کے پیچھے بھاگیں۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُہُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا.[2]، ترجمہ: "اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں سراب، جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔"

یہ جتنا دلکش ہے اتنے ہی سنگین اور خطرناک نتائج رکھتا ہے، جن میں سے کچھ اس کتاب کے محترم قارئین جان لیں گے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں ممکن ہے سالک کو خواب کی دنیا میں کچھ حقائق کا ادراک ہو اور رفتہ رفتہ روحانی ترقی کے نتیجے میں یہ حالت بیداری کی حالت میں بھی طاری ہونے لگے۔

کشف اور خواب کا موضوع چونکہ اہلِ تصوف کے بہت سے عقائد و نظریات کی بنیاد اور منبع ہے اور اکثر اوقات بدعتی اذکار اور کسی کو پیر بنانے کا عمل اسی کی بدولت ہوتا ہے، اس پر گہری تحقیق کرنا اور توجہ دینا ضروری ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان کا محل کس قدر کمزور بنیاد پر کھڑا ہے۔ سچ پوچھئے تو کشف اور خواب کے یہ دو موضوعات اگر ان سے چھین لیے جائیں تو ان کے ہاتھ خالی رہ جائیں گے اور ان کی کرامات کی دکان بند ہو جائے گی۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کشف اور شہود کے دعوے صرف صوفی برادری کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ بہت سے قدیم فلسفی بھی اس کام میں ان کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ ایک طرف وہ کشف پر یقین رکھتے ہیں تو دوسری جانب وہ عقلی دلائل کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ بہرحال چونکہ یہ مسئلہ نفسیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کا علمِ نفسیات کی رو سے جائزہ لینا چاہیے۔ اصل بات شروع کرنے سے پہلے، ہمیں اس مسئلے سے متعلق چند چیزوں کی وضاحت کرنی ہوگی۔

---

[1] صفوۃ الصفا

[2] سورہ نور، آیت 39۔

1۔ ہپنوسس کیسے پیدا ہوتا ہے؟

نفسیات کے ایک ماہر نے ”ہپناٹزم“ کے موضوع پر لکھی ایک کتاب میں کہا ہے کہ ہپنوسس (hypnosis) اور ٹرانس (trance) کی حالت صرف وہی شدید حالت نہیں ہے جو کوئی غافل کنندہ (hypnotist) کسی شخص پر طاری کر دے، بلکہ اس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جو ذہن کو فطری توازن کی حالت سے باہر نکالنے کا باعث بنتی ہیں۔ مثلاً اگر نیند جیسی حالت ہو جس میں سرور یا غم طاری ہو جائے، یا موسیقی کی مختلف دھنیں اور خوشی یاد کھ بھرے گانے سن کر عقل (reason) معطل ہو جائے، تو یہ سب چیزیں بھی کسی انسان میں ہپنوسس کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ ان کے نتیجے میں دماغ میں بے ہوشی کی ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو دراصل نیند کا ہی ایک کمزور مرتبہ ہے۔ دقت کیجئے[1]!

وہ تمام چیزیں جو ذہنی کمزوری کا باعث بنتی ہیں، جیسے کسی عمل کا بار بار دہرانا اور موسیقی کے ساتھ کسی آواز کو بار بار سننا، گویا کسی میز پر چھڑی سے لگاتار ضربیں لگائی جا رہی ہوں، سب کا یہ اثر ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نیند جیسی ذہنی سستی پیدا کرنے میں مؤثر ہوتی ہے۔ جانوروں کے گلے میں جو گھنٹیاں بندھی ہوتی ہیں یا جنگ کے دوران جو موسیقی بجائی جاتی ہے، سب میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ جانور یا انسان ایک خاص ذہنی غفلت کی حالت میں چلا جائے اور اس وجہ سے اس کی سنگینی کم ہو، اسے بار برداری یا لمبا راستہ طے کرنے میں تکلیف کا احساس نہ ہو۔ نسل در نسل منتقل ہونے والے تجربات کی بنیاد پر مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لیے اسی اصول کا استعمال کرتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کو لوریاں سنا کر اور ان کی پیٹھ پر خاص آہنگ کے ساتھ تھپکیاں لگا کر سلا دیتی ہیں۔ ہپناٹزم کے ماہرین لوگوں کو سلانے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں، اور ان میں سے سب سے آسان ایک میز پر لگاتار چھڑی مارنا ہے، اور ان کا ماننا ہے کہ ہپنوسس ایسے ماحول میں آسان ہوتا ہے جہاں غمگین یا خوش کن گانے چلائے جا رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیات کے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص شدید خوشی یا شدید غم کی حالت میں ہو تو اسے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایسے حالات میں ذہن توازن کھو چکا ہوتا ہے اور سنی سنائی پر چلنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ میں ابن عربی لکھتا ہے کہ مکاشفے کی حالت میں اسے خاتم الاولیاء بنایا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ میرے پاس تمام انبیاءؑ تشریف لائے اور ان میں سے کسی نے بات نہیں کی سوائے ہود علیہ السلام نے، جو کہ بھاری جسم والے، خوبصورت اور فصیح آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ انبیاءؑ کیوں آئے؟ وہ تمہیں ولایت کی خاتمیت پر فائز ہونے کی مبارکباد دینے کے لیے آئے ہیں۔ تمام انبیاءؑ کو خاتم الانبیاء کے چراغ سے علم حاصل ہوتا ہے اور ان کو خاتم الاولیاء کے چراغ سے علم حاصل ہوتا ہے۔ (فصوص الحکم جلد1، صفحہ 63۔ فتوحات مکیہ، جلد1، صفحہ 244۔) نفحات الانس میں محمد غزالی کے حالات کے بیان میں جامی ایک بڑے پیر کا مکاشفہ بیان کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: ایک دن میں دو نمازوں کے درمیانی وقفے میں مسجد الحرام میں داخل ہوا۔ وہاں مجھ پر صوفیوں کا وجد اور حال طاری ہوا۔ نیند اور بیداری کے درمیان کی ایک حالت میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ کھڑے ہیں اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک مجلد کتاب ہے۔ سامنے گویا رسول خدا ﷺ تشریف فرما تھے۔ یہ لوگ اصحاب مذاہب تھے۔ یہ اپنے عقائد کی کتابیں لائے تھے اور رسول خدا ﷺ کو پڑھ کر سنا رہے تھے اور ان کی تائید حاصل کر رہے تھے۔ ایک شیعہ عالم نے اپنی کتاب سنانا چاہی تو وہاں موجود ایک شخص نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر پرے پھینک دی۔ (نفحات الانس، صفحات 371 تا 373۔) یہ صوفیوں کے مشائخ کے مکاشفات کے محض دو نمونے ہیں۔ ان کی کتابیں اس قسم کی خام خیالیوں، باطل افکار اور بے بنیاد دعووں سے بھری ہوئی ہیں۔ داؤد الہامی

ان باتوں سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ مختلف جملوں کو بار بار دہرانا، جیسا کہ پیر اور روحانی باب مختلف اذکار کو دہرانے کا کہتے ہیں، بالخصوص اگر کسی خاص ردھم اور آہنگ میں ہو، اور قوالیوں وغیرہ کا سننا جنہیں سُریلی آواز والے گویوں نے گایا ہوتا ہے، ذہنی حالت کو دگرگوں کر دیتا ہے۔ یہ سب چیزیں اپنے اپنے انداز میں دماغ کو سلانے کا کام کرتی ہیں۔ اگر یہ اشعار ادبی طور پر بلند پایہ ہوں اور ان میں عرفانی اور ذوقی مفاہیم کی آمیزش ہو تو ان کی تاثیر بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے انہیں سن کر انسان خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرے۔

2۔ علمِ نفسیات کی رو سے تلقین کے اثرات

اسی ماہرِ نفسیات کے مطابق عقیدہ اور تلقین بھی ہپنوسس اور ٹرانس کی کیفیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے اس تکنیک کے ماہر افراد لوگوں کو سلانے کے لیے ان چیزوں کا سہارا بھی لیتے ہیں اور ایسے الفاظ میں تلقین کرتے ہیں جیسے: "آپ سونے کے قریب ہیں"، "آرام کریں، آپ کو نیند آ رہی ہے"۔ "آپ کی پلکیں بھاری ہیں، گویا ابھی آنکھیں بند ہو جائیں گی"، وغیرہ۔ ان تلقینات سے ان کو مثبت نتائج بھی ملتے ہیں۔

آئیے زیادہ دور نہ جائیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنی زندگی میں اس چیز کا تجربہ کیا ہے کہ اکثر اور مسلسل تلقین کے نتیجے میں لوگوں کی سوچ میں کافی حد تک تبدیلی لانا یا ان کو مکمل طور پر تبدیل کرنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر جو لوگ بعض غذاؤں کو کھانا پسند نہیں کرتے، وہ تلقین کے نتیجے میں انہیں کھانے کے لیے اتنے مائل اور آمادہ ہو جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف ان سے نفرت نہیں کرتے، بلکہ انہیں کھانے میں دلچسپی ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اشتہارات اور تبلیغات کے ذریعے عوام کے کسی من پسند مشروب کو بدنام کر کے ان کو یہ مشروب پینے سے باز بھی رکھا جا سکتا ہے۔ جن باتوں کی ترغیب دلانا مقصود ہو انہیں ادب اور شاعری کی صورت میں سامنے لایا جائے تو تلقین کا اثر زیادہ ہو گا اور بعض اوقات حیران کن اثرات ظاہر ہوں گے۔ شاعروں کی سوانح عمریوں میں اور تاریخ کی کتابوں میں ایسے بہت سے قصے بیان کیے گئے ہیں جو افکار و احساسات پر تلقین اور عقیدے کے نتیجہ خیز اثرات کو واضح کرتے ہیں۔ اگر وقت اور جگہ اجازت دیتی تو ہم ان میں سے کچھ یہاں بیان کر دیتے۔ اکثر لوگوں نے ان میں سے کچھ کو سن رکھا ہو گا۔

یقیناً وہی اثر جو دوسروں کی تلقین انسان کے ذہن پر رکھتی ہے وہ اس کی اپنی تلقین بھی اس پر رکھتی ہے۔ مثلاً وہ لوگ جن کی قوت ارادی کمزور ہو اور ان میں خجالت اور بے جا شرم ہو اور شکی مزاج ہوں، وہ اپنے آپ کو اچھی باتوں کی تلقین کر کے اس حالت سے نکل سکتے ہیں یا کچھ نہ کچھ بہتری لا سکتے ہیں۔ الہام اور تلقین کا موضوع نفسیات میں بہت دلچسپی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کے حوالے سے بھی اہم ہے اور اس علم کے ماہرین اس طریقہ کو اخلاقی تعلیم و تربیت کے لیے کامیابی سے استعمال کرتے رہے ہیں۔

3۔ اوہام کا تجسم!

ایک اور مسئلہ جو ان سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کسی موضوع کے بارے میں حد سے زیادہ سوچنے اور دماغ میں اس کی تکرار کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ کوئی خارجی شکل اختیار کر لے، یعنی سوچنے والے کی نظروں کے سامنے مجسم ہو جائے۔ نیند کی حالت میں بعض اوقات ہمیں ایسی چیزیں خواب میں دکھائی دیتی ہیں جن کے بارے میں ہمارا دماغ سوچتا رہا ہو۔ کبھی ایسا بیداری کی حالت میں بھی ہو سکتا ہے اور کمزور ذہن والوں کے

ساتھ ایسا کئی بار ہو سکتا ہے۔ شاید اکثر لوگوں کو اس چیز کا تجربہ ہوا ہو کہ وہ جن امور پر دن میں بہت زیادہ توجہ دیتے اور سوچتے ہیں، وہ رات کو خواب میں ان سے ملتے جلتے کام ہوتے دیکھتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں: انہوں نے فجر یا رات کے وقت ویران جگہ پر جنات کو دیکھا ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جنات موجود ہیں اور وہ خدا کی مخلوقات میں سے ہیں، خواہ وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ کیوں نہ ہوں، کیونکہ ان کے وجود کا قرآن کریم میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کیا وہ وہی ہیں جنہیں لوگوں نے کسی ویران جگہ پر دیکھا ہوتا ہے؟ جن کی شکل و صورت کسی انسان یا جانور سے ملتی ہے؟! کچھ لوگوں نے کسی خیالی پیکر کو دور دراز کے بیابانوں میں یا رات کے وقت قبرستانوں میں دیکھا ہو گا، لیکن یہ چیزیں ان کے اپنے وہم کے مجسم ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ علمِ نفسیات کے موضوعات میں سے ایک وہم کے جسمانی شکل میں ظاہر ہونے کا مسئلہ بھی ہے، اور بہت سے عوام نے اپنی زندگی کے دوران اس کا تجربہ کیا ہوتا ہے۔

انسانی مزاج کا بھی اس حصے پر بڑا اثر ہے۔ یعنی مشکل ریاضتیں کرنے یا بیماری یا زندگی میں مشکلات کی وجہ سے انسان کا فطرتی توازن بگڑ جائے تو خیالات کے تجسم کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اوہام زیادہ آسانی سے خارج میں کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مزاج کا نیند اور خوابوں کی کیفیت سے براہ راست تعلق ہے۔ قدیم طبیبوں اور فلسفیوں نے بھی خوابوں میں برف دکھنے اور اس جیسی چیزوں کو فطرتی گرمی میں کمی اور مزاج پر سردی کے غلبہ کے ثبوت کے طور پر لیا ہے۔ اسی طرح خواب میں آگ دیکھنے کو مزاج کی گرمی سے تعبیر کیا ہے۔ بارش کے نظارے کو رطوبت کے مزاج پر غلبے کی دلیل کے طور پر لیا ہے۔ حکیم سبزواری نے اپنی منظومہ میں کہا ہے :

تبدلت افعالها بحسبه فمن حرور غالب فی قالبه
حاکی بنیران و شبهه و من یغلبه مر، صفرا او سودا علن
و من علیه البرد یغلب فیری ثلجا و من علیه رطب مطرا

چنانچہ قدیم طبیب بھی بیماریوں کی تشخیص کے لیے مریض کے خوابوں کی نوعیت پر بھی غور کیا کرتے تھے۔ اب علمِ نفسیات کے ان چند اصولوں پر غور کرتے ہوئے ہم کشف، شہود اور خوابوں کے مسئلے کی طرف بڑھیں گے جو صوفی برادری اور ان کے پیروکاروں کا اصل اثاثہ ہیں۔

ایک نووارد شاگرد سے لے کر مرشد اور پرانے تجربہ کار پیر تک، ہر ایک کا بغور جائزہ لینا چاہیے اور ان کے مکشوفات اور خوابوں کی وضعیت پر تحقیق کرنی چاہیے۔ شروع میں سادہ لوح مرید کچھ لوگوں کے کہنے میں آ کر یہ عقیدہ بنا لیتا ہے کہ اسے نیند اور خواب کے وسیلے سے سچا مرشد اور رہنما تلاش کرنا چاہیے۔ دن بہ دن یہ مسئلہ اس کے ذہن میں زور پکڑتا چلا جاتا ہے اور وہ خوابوں کی دنیا میں اس مرشد کے جمال کی زیارت کا ہر وقت منتظر رہتا ہے۔ البتہ ایسے شخص نے اکثر کچھ لوگوں کو اپنی رائے میں اس عہدے کے لیے موزوں سمجھ لیا ہوتا ہے اور اگر اس نے ان کا تعین نہیں کیا ہے تو بھی اس نے سچے مرشد کی خصوصیات کو کسی نہ کسی طرح طے کر لیا ہوتا ہے۔ اگر وہ مرید ریاضتیں کرتا ہو تو اس کے مزاج میں فطری توازن سے انحراف کی وجہ سے اس کے تخیل میں طغیانی آنے لگتی ہے۔ لوگوں کی تلقین بھی اس پر اثر ڈالتی ہے۔

اچانک ایک رات نیند کی دنیا میں انہی افکار اور ریاضتوں کی وجہ سے اس کے مطلوبہ مرشد جیسی شکل اسے دکھائی دیتی ہے۔ وہ فوراً اس سے چمٹ جاتا ہے اور اگر وہ اس کے مقصد سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتی تو کسی جواز اور تاویل کی مدد سے اس شکل کی مرمت کر کے مرشد کی شکل کے

مطابق بناتا ہے اور اس طرح اس کی عقیدت کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ بعض اوقات جاگتی دنیا میں بھی ایسا ہی معاملہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس بیچارے مرید کی آنکھیں اور کان مسلسل غیب کی دنیا پر مرکوز رہتے ہیں اور وہ ہر وقت اس انتظار میں رہتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی دروازہ اس کے لیے کھلے یا اس کے کانوں میں کوئی سرگوشی ہو۔ اچانک، تخیل کی سرگرمی کی وجہ سے، وہ ایسی آوازیں سنتا ہے جو فوری طور پر اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ پھر وہ ان کی من پسند تفسیریں کرتا ہے۔

لیکن جو لوگ دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، یعنی ذکر اور ریاضت کے مرحلے میں، اگر وہ فریب کار نہ ہوں اور اپنے کام پر پکا یقین رکھتے ہوں تو جب وہ خانقاہ کے اندر داخل ہوتے ہیں تو ان کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات گردش کرتے ہیں۔ محفل شروع ہوتی ہے، مخصوص دھنوں کے ساتھ رومی کی مثنوی یا دیگر اشعار کو پڑھا جاتا ہے، ذوقی اور نشاط آور باتوں کو دھنوں کے ساتھ سن کر ان کا دماغ سست ہو جاتا ہے اور روح اپنا فطری توازن کھو بیٹھتی ہے، یعنی ہپنوسس کا وہی کمزور مرحلہ آتا ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا تھا۔ سابقہ تلقینات اور اس محفل میں ہونے والی گفتگو میں اس حالت کی تائید ہوتی ہے اور سالک لطف اور مسرت کی ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ بدن پر سستی اور سکون طاری ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات خوشی کی شدت اور دماغی راحت کی وجہ سے وہ پوری طرح مست ہو جاتا ہے، جیسا کہ صوفی اسے جوش و خروش اور رقص کی حالت کہتے ہیں۔ اس وقت اجتماعی ذکر، نعرے بازی یا شاعری شروع ہوتی ہے اور اسے ایک مخصوص دھن میں باقاعدگی سے دہرایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں روح کا اپنی فطری حالت سے انحراف بڑھ جاتا ہے اور عقل کی سرگرمیاں مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہیں اور تخیل کیلئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اذکار یا اشعار کی کثرت سے تکرار اس جوش و خروش کے ساتھ مل کر غفلت کی ایک کیفیت پیدا کرتی ہے اور تخیل کی قوت کو مسلسل تقویت دیتی ہے۔ پچھلی ریاضتوں نے بھی اپنا کام کیا ہوتا ہے اور تخیل کی قوت کی سرگرمی کے لیے زمین تیار کر دی ہوتی ہے۔ مرید نجانے کب سے کسی مکاشفے کے ہونے اور کسی منظر کے دیکھنے کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

یہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ہیں اور بیچارے سالک کو، جو غیب کی دنیا کا مشاہدہ کرنے اور مکاشفے کا منتظر ہوتا ہے، ایسی دنیاؤں میں لے جاتی ہیں جہاں نور ہی نور ہوتا ہے۔ کوہ طور، سات آسمانوں، سات زمینوں، وغیرہ وغیرہ کو اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ کوئی بھی شکل و صورت جس کی طرف اس کا تخیل مائل ہو، سالک کی آنکھوں کے سامنے آسانی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ بھی ان نظاروں کو دیکھ کر بے حد خوش ہو جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ اس نے مطلوبہ مشاہدے کو پا لیا ہے، چیختا چلاتا ہے۔ یوں اس حالت کی دوبارہ تائید ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ کوما جیسی حالت میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ کسی ایسے پیر یا مرید کے ساتھ ہوتا ہے جس نے اس سلسلے میں کوشش کی ہو۔ البتہ کشف اور شہود کا موضوع ان شکلوں سے مخصوص نہیں ہے جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ممکن ہے اس ایک ہی اصول کے تحت مختلف طریقوں سے تنہائی یا مجلس میں، گھر یا بازار میں، کہیں بھی کسی کو ایسا ہی تجربہ ہو۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ مکاشفے جن کا صوفیاء اور مشائخ دعویٰ کرتے ہیں، بالفرض کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے، اکثر قوت خیال کی سرگرمی کا نتیجہ ہیں اور یہ بھی نفسیات کے ناقابل تردید اصولوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں صحراؤں میں مسافروں کی آنکھوں کے سامنے آنے والے سرابوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سراب سورج کی روشنی کے انعکاس اور انعطاف کے اصولوں کا نتیجہ

ہوتے ہیں، اور یہ مکاشفے تخیل کی قوت کے بروئے کار آنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں حقیقت سے عاری ہوتے ہیں۔

4۔ صوفیوں کے مکاشفوں کے نمونے

یہاں ہم ان مکاشفوں کی چند مثالیں پیش کریں گے جن کا دعویٰ اس گروہ نے کیا اور انہیں اپنی کتابوں میں لکھا، تاکہ جو کچھ کہا گیا ہے اس پر قابل احترام قارئین کو مزید اطمینان حاصل ہو جائے۔

1: کتاب صفوۃ الصفا میں، جو شیخ صفی الدین اردبیلی کے حالات کے بیان میں اس کے ایک شاگرد کی طرف سے لکھی گئی ہے، روایت ہے کہ ایک پختہ کار شخص نے شیخ سے کہا: خواب میں میں نے شیخ کی آستین کا ایک سرا عرش اور دوسرا زمین سے لگا ہوا دیکھا۔ شیخ نے کہا: بیٹا! یہ آپ کو اتنا ہی دکھایا گیا ہے جتنا آپ برداشت کر سکتے ہیں! بقول شاعر:

آستین بر عالم کون و مکان افشاندہ ایم　　　ماورای این و آن در آستین داریم راز

مصنف کہتا ہے: جس کی آستین اتنی چوڑی ہو اس کے باقی لباس کے کیا کہنے، اگرچہ یہ بھی مرید نے اپنے حوصلے کے تناسب سے دیکھا ہے!

2: اسی کتاب کے صفحہ 331 پر لکھا ہے کہ جبرائیل گیلانی نے اپنے بھائی پیر محمد سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں پہلی بار شیخ صفی کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھ پر کشف کی کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے دیکھا شیخ کا پاؤں تحت الثری پر، سر علیین پر، دایاں کندھا کوہ قاف کے ایک کنارے پر اور بایاں کندھا کوہ قاف کے دوسرے کنارے پر ہے۔ میں چلا کر باہر نکل گیا۔ ایک ساعت کے بعد شیخ نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیوں چیخ رہے ہو؟ میں نے اسے وہی کچھ بتایا جو میں نے دیکھا تھا۔ چاہے آپ جتنا بھی حسن ظن کر لیں، کیا آپ کو ایسی باتوں کے پیچھے قوت تخیل کی کارفرمائی کے سوا کوئی چیز نظر آتی ہے؟

3: اسی کتاب کے صفحہ 330 پر وہ خواجہ محمد سراوی کا حوالہ دیتا ہے کہ میں نے خواجہ افضل سراوی کے خادم پیر محمود سے سنا کہ اردبیل میں خواجہ افضل شیخ صفی سے رخصت لے کر سراو جانے لگا تو شیخ نے اس سے کہا: میرے سامنے سوار ہو جاؤ، خواجہ افضل سوار ہوئے اور سفر کا آغاز کیا۔ اردبیل سے آدھا فرسنگ دور جا کر دیکھا تو شیخ بڑے ہونے لگا۔ بڑھتے بڑھتے اتنا پھیل گیا کہ پورا صوبہ اردبیل اس سے بھر گیا۔ میں نے بے خود ہو گیا، چیخ ماری اور گھوڑے سے گر پڑا۔ یہ حالت خواجہ افضل کو پسند نہ آئی اور اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جو دیکھا تھا اسے بتایا۔ اس نے کہا: "اے اندھے! یعنی شیخ بس اتنا بڑا ہے کہ اردبیل کا علاقہ اس میں سما جاتا ہے؟ تم نے جو کچھ دیکھا اپنی اوقات کے مطابق دیکھا۔" مصنف کہتا ہے: یہ صحیح معنوں میں وہم کا مجسم ہونا ہے۔

4: محی الدین ابن عربی، جو اس راستے کے بڑے پیروں میں سے ہے، اپنی کتاب میں لکھتا ہے: رجبی وہ لوگ ہیں جو ایک قسم کی ریاضت کے حامل ہیں، اور اس کا ایک اثر یہ ہے کہ وہ مکاشفے کی حالت میں رافضیوں (شیعوں) کو خنزیر کی شکل میں دیکھتے ہیں۔[1] مصنف کہتا ہے: یہ رجبی پیر در اصل اپنی شکل کو شیعوں کے آئینۂ وجود میں منعکس پاتے ہیں۔ کیا ایسا مکاشفہ وہم و خیال و پندار کے سوا کچھ ہے؟

5: شیخ عطار اپنی کتاب تذکرۃ الاولیاء کے صفحہ 102 پر بایزید بسطامی کے حالات میں لکھتا ہے کہ اس نے کہا: خدا تعالیٰ نے مجھے ایسی جگہ پہنچایا جہاں میں نے تمام مخلوقات کو اپنی دو انگلیوں کے درمیان دیکھا۔ اور اسی صفحہ پر دوبارہ بیان کرتا ہے کہ میں تھوڑی دیر تک خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا، جب میں حقیقت پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ خانہ کعبہ میرے ارد گرد طواف کر رہا ہے۔ مصنف کہتا ہے: تصوف کے پیشواؤں کی یہ مکروہ اور لایعنی ڈینگیں ان کے مکاشفات اور دعوؤں کے باطل ہونے کا بہترین ثبوت ہیں، یہ ایسے دعوے کرتے ہیں جو آج تک کسی مقرب فرشتے یا نبی نے بھی نہیں کئے۔

اسی کتاب کے صفحہ 101 پر لکھتا ہے کہ بایزید نے کہا: خدا تعالیٰ نے مجھے دو ہزار جگہوں پر اپنے سامنے حاضر کیا اور ہر جگہ مجھے ایک سلطنت پیش کی، لیکن میں نے قبول نہیں کیا۔ مصنف کہتا ہے: کیا آپ نے کبھی خدا کے بھیجے ہوئے عظیم انبیاءؑ یا آئمہ اطہارؑ میں سے کسی کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے سنا ہے؟ کیا یہ خیالی مقامات تخیل کی پیداوار نہیں ہیں؟ مختصر یہ کہ صوفیوں کی کتابوں میں اس طرح کے خیالات اور موہومات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں اور اس مختصر کتاب میں اس سے زیادہ بیان نہیں ہو سکتے۔

5۔ مدعیانِ کشف کی عجیب و غریب غلطیاں

کشف کے دعویداروں کے مذہب پر سب سے شدید ضرب جس بات سے لگتی ہے اور جو چیز ان کے مکاشفات کے خیال بافی پر مبنی ہونے کو عیاں کرتی ہے وہ ایسی سنگین غلطیاں ہیں جو ان کے بڑوں سے سرزد ہوئیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ان لوگوں میں جو اپنے آپ کو حقائق اور ضمائر کا علم رکھنے والا سمجھتے ہیں اور بعض نے روحانی معراج تک کا دعویٰ کیا ہے، ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی، یا کم از کم اس کا ایک بڑا حصہ، ایک دوسرے کے مخالف مسالک کے پیروکاروں کے طور پر گزاری ہے، اور ان باہم متضاد عقائد کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں۔ ایسے لوگوں میں ابو حامد غزالی، محی الدین ابن عربی اور شہاب الدین سہروردی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس اعتراض پر کشف کے حامیوں کا کیا جواب ہے؟ کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ کشف کے حامل نہیں تھے، اور اگر ان کو کشف ہوتا تھا تو یہ آپس میں عقائد و مذاہب کا تضاد کیوں رکھتے تھے؟

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَ لَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ.[2] ترجمہ: "کیا مومنین کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر خدا سے اور نازل ہونے والے حق سے نرم ہو جائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی پھر ایک طویل مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے؟ اور ان میں سے بہت سے لوگ فاسق ہیں۔"

---

[1] ابن عربی، فتوحاتِ مکیہ، جلد 2، صفحہ 8۔

[2] سورہ حدید، آیت 16۔

اطمینانِ خاطر کیلئے ان کے بڑوں اور میدانِ کشف و شہود کے شہسواروں کے کچھ حالات اور نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں تا کہ دیگ کے چند چاول کھا کر جان سکیں کہ پوری دیگ کیسی ہے؟

1:غزالی اور احیاء العلوم

ابو حامد محمد بن محمد بن محمد الطوسی المعروف غزالی، پانچویں صدی ہجری کا ایک عالم تھا جو 450 ہجری میں طابران طوس میں پیدا ہوا۔ وہ مذہب میں محمد بن ادریس شافعی کا پیروکار تھا۔ اس نے کچھ مذہبی مسائل میں ایک خاص تعصب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا سنِ وفات 505 ہجری لکھا ہے۔[1] اپنی جوانی کے آغاز میں غزالی نے مختلف دینی علوم کو سیکھا اور آخر کار بغداد کے مدرسۂ نظامیہ میں تدریس کے عہدے پر فائز ہوا۔ تاہم اس کی حالت دگرگوں ہوئی اور اس نے درس اور بحث کو بالکل ترک کر دیا اور عرفان اور تصوف کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے اپنی مشہور کتاب احیاء العلوم لکھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک فاضل اور صاحب علم آدمی تھا اور بعض علوم بالخصوص علم اخلاق میں مہارت رکھتا تھا، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ بدقسمتی سے ان میں وہ ذوق و شوق نہیں تھا جو کسی بھی عالم کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اس نے بہت بڑی غلطیاں کیں جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خدا نہ کرے کوئی اس کی اندھی تقلید کرنے لگ جائے۔

ابو الفرج ابن جوزی (متوفیٰ 597 ہجری) مشہور سنی مصنفین میں سے ایک ہے اور مرحوم محدث قمی کے مطابق وہ علمِ تفسیر، حدیث، دیگر علوم اور وعظ کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے "اعلام الاحیا باغلاط الاحیا" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے غزالی کی کتاب احیاء العلوم کی غلطیوں کو ایک ایک کرکے درج کیا۔ اس کی ایک اور کتاب "تلبیس ابلیس" بھی ہے جس میں اس نے غزالی پر بھی وار کیا اور اسناد اور مدارک کا حوالہ دے کر اس کی کتاب احیاء العلوم پر تنقید کی۔ یہاں ہم کتاب تلبیس ابلیس (صفحہ 597 اور 379) میں سے اس کے کلام کے ایک حصے کو پیش کرتے ہیں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ کتاب احیاء العلوم میں اگرچہ مفید باتیں بھی ہیں لیکن یہ اوہام اور خرافات سے خالی نہیں ہے اور اس کے تمام مواد کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

1۔ ابو حامد غزالی کہتا ہے کہ ایک شیخ کو آغاز میں شب بیداری کرنے میں کاہلی مانع تھی لہٰذا اس نے اپنے اوپر یہ لازم کیا کہ وہ ساری رات سر کے بل کھڑا رہے تا کہ وہ شب بیداری میں میل و رغبت پیدا کرے۔

2۔ ایک دوسرے شیخ نے اپنا سارا مال سمندر میں پھینک دیا تا کہ اس کے دل سے دولت کی محبت نکل سکے۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے لوگوں کو دیا تو وہ ریاکار ہو جائے گا!

3۔ ایک اور شیخ نے صبر اور برداشت کی عادت ڈالنے کے لیے ایک شخص کو اس کام پر رکھا کہ اجتماعات میں اسے برا بھلا کہا کرے۔

4۔ ایک شیخ شجاعت حاصل کرنے کے لیے سردی میں طوفان اور تلاطم کے وقت کشتی رانی کیا کرتا تھا۔ یوں وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالتا۔

---

[1] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد 12، صفحہ 173–174۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، جلد 1، صفحہ 588 – 586۔

ان عجیب وغریب قصوں کو بیان کرنے کے بعد جو عقل و شرع سے دور ہیں، مذکورہ عالم (ابوالفرج) لکھتا ہے: مجھے ابوحامد غزالی پر ان لوگوں سے زیادہ حیرت ہے جنہوں نے ان مذموم حرکتوں کا ارتکاب کیا، کیونکہ ان کو بیان کرنے کے بعد غزالی نے نہ صرف ان کی کسی قسم کی مذمت نہیں کی بلکہ ان کو لکھنے سے اس کا مقصد دوسروں کو کچھ سکھانا ہے۔

5۔ ابوحامد غزالی کہتا ہے: شیخ یا مرشد کو چاہیے کہ وہ مبتدی اور نووارد مرید کے حالات پر غور کرے۔ اگر اس کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہو تو وہ اس سے لے کر کسی نیک کام پر خرچ کرے اور اس کا دل اس کے خیال سے خالی کر دے۔ اگر اس پر تکبر غالب آجائے تو اسے بازار بھیج کر بھیک مانگنے کا حکم دے۔ اگر اس پر سستی اور کاہلی غالب آجائے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے باورچی خانہ صاف کرنے اور گندی جگہوں پر جھاڑو دینے کا حکم دے۔ اگر اسے کھانا کھانے کی شدید خواہش ہوتی ہو تو اسے روزہ رکھوائے۔ اگر اس پر جنسی شہوت غالب آئے اور روزے سے وہ ختم نہ ہو تو اسے حکم دو کہ ایک رات صرف پانی سے افطار کرے اور ایک رات صرف ایک روٹی سے افطار کرے اور اسے گوشت کھانے سے منع کرے۔

غزالی کے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد مذکورہ عالم کہتا ہے: مجھے اس پر بہت تعجب ہوا کہ وہ لوگوں کو ان کاموں کی ترغیب کیسے دیتا ہے جو شریعت کے خلاف ہیں۔ کیا یہ جائز ہے کہ انسان صبح ہونے تک رات بھر سر کے بل کھڑا رہے، اس سے اس کے چہرے میں خون اتر آئے اور خطرناک بیماریاں پیدا ہو جائیں؟ اور کوئی اپنے مال کو سمندر میں کیسے پھینک سکتا ہے حالانکہ حضورؐ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کیا بلا وجہ مسلمان پر سب وشتم کرنا جائز ہے؟ اور کیا اس کام کے لیے کسی مسلمان کو ملازم رکھنا غلط نہیں ہے؟ اور سمندر میں طوفان اور خطرے کے وقت جہاز میں سوار ہونا کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے، حالانکہ ایسے موقع پر حج کا سفر بھی ترک کیا جا سکتا ہے؟ نیز جو شخص کام کاج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لیے بھیک مانگنا کیونکر جائز ہے؟! وہ اپنی بات یوں ختم کرتا ہے: ابوحامد غزالی نے تصوف کے لیے فقہ (دین کی سمجھ بوجھ) کو بہت سستے میں قربان کر دیا ہے!

6۔ غزالی ابن کرینی سے روایت کرتا ہے کہ ایک مرتبہ میں ایک علاقے میں رہنے لگا اور وہاں میں نے اچھی شہرت پائی اور اپنی نیکی اور دیانتداری کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ایک دن میں عوامی غسل خانے میں گیا اور وہاں سے ایک مہنگا لباس چرا لیا اور اسے اپنے پرانے اور خستہ حال کپڑوں کے نیچے پہن لیا۔ میں حمام سے باہر آیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگ پڑا۔ لوگ مجھے پکڑنے کے لیے بھاگے اور میرے پرانے کپڑے پھاڑ کر وہ مہنگے کپڑے باہر نکال لیے۔ اس واقعے کے بعد میں لوگوں میں حمام کے چور کے نام سے مشہور ہوا اور اس سے میری روح کو سکون ملا!!

اس نامناسب اور برے قصے کو بیان کرنے کے بعد غزالی کہتا ہے: وہ لوگوں اور اپنے نفس سے توجہ ہٹانے کے لیے اس طرح کی ریاضتیں کرتے تھے۔ بعض اوقات اہلِ حال ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو فقہاء کے حکم کے خلاف ہوں تاکہ وہ اپنے دلوں کی اصلاح کریں اور بعد میں اس ظاہری خطا کی تلافی کریں، جیسا کہ اس شخص نے حمام میں کیا تھا۔

اس کو بیان کرنے کے بعد ابوالفرج ابن الجوزی کہتا ہے: سبحان اللہ، کس نے غزالی کو دائرۂ فقہ سے نکال دیا اور اس کتاب احیاء العلوم کو لکھنے پر لگا دیا؟ کاش اس نے ایسے نامناسب امور اپنی کتاب میں بیان نہ کیے ہوتے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان کو بیان کر کے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ ان کی تعریف و توصیف بھی کرتا ہے اور ایسے کام کرنے والوں کو اہلِ حال کہتا ہے۔ ایک شخص اپنی نیکی اور صلاح کو شریعت کے احکام کی مخالفت میں پائے تو اس

سے بڑھ کر کیا برا ہو سکتا ہے۔ کیا ایسے معاملات میں مشغول ہونے کے علاوہ دل کی اصلاح کا کوئی صحیح طریقہ نہیں تھا؟ اور کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو چور کہلوائے اور اپنے آپ کو چور مشہور کرے؟ کیا لوگوں کا مال ان کے مالکان کی رضامندی کے بغیر لینا جائز ہے؟ حالانکہ غزالی کے پیشواؤں احمد بن حنبل اور شافعی نے واضح کیا ہے کہ اگر کوئی غسل خانے سے کسی کا لباس چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اس لیے غزالی کا عمل اس چور کے عمل سے زیادہ حیران کن ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ان دونوں سے زیادہ حیران کن عمل ان لوگوں کا ہے جو آنکھیں بند کر کے اور اپنی سمجھ اور عقل کو استعمال کیے بغیر ان تعلیمات کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ ان کے بارے میں اس حد تک مبالغہ آرائی کرتے ہیں کہ ان لوگوں کا شمار اسلام کے ممتاز علماء میں کرتے ہیں اور انہیں کشف و شہود کے مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔ اگر کشف اور شہود کا مطلب یہ توہمات ہیں تو ہر ناجائز کام کو کشف کہا جانا چاہیے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ غزالی نے امامت اور آئمۂ اطہارؑ کی بارے میں عجیب ناانصافیوں اور تعصبات کا مظاہرہ کیا ہے جو کسی بھی غیر جانبدار شخص کو حیران کر دے گا۔ ہماری کتاب میں اتنی جگہ نہیں ورنہ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر چہل مقالہ سے ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے۔ چہل مقالہ کا مصنف صفحہ 87 پر لکھتا ہے: ان عظیم علماء میں سے جو تقویٰ، فضیلت، زہد اور عبادت میں پہلی صف کی مسلم شخصیات میں شامل ہیں، وہ اس قدر احتیاط، خوف اور وحشت کے ساتھ چلتے ہیں کہ وہ یزید پر لعنت بھیجنا بھی جائز نہیں سمجھتے، جو بدکاری اور خیانت کا مجسمہ ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک اہل قبلہ شخص تھا۔ بعد میں وہ واضح کرتا ہے کہ پچھلے جملے میں بڑے بڑے علماء سے مراد غزالی تھا۔[1] اور پھر وہ اسلام کے عظیم فقہاء پر گھٹیا حملے کرنے لگتا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ گویا یہ بے خبر شخص ایسا گمان کرتا ہے کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہونے کا اعتراف کرے اور اسلام پر اپنے ایمان کا اظہار کرے، اور اپنے آپ کو اہلِ قبلہ میں شمار کرے، وہ سچا مسلمان ہے، اور اس کی جان، مال اور عزت کا احترام کیا جائے گا، خواہ وہ ہزار جرائم کا ارتکاب کرے، مذہبی نوامیس کی توہین کرے اور اسلام کی بنیاد کو تباہ کر دے۔ یہ عقیدہ کسی منطق اور استدلال سے درست نہ ہونے کے علاوہ اسلام کی واضح ہدایات کے بھی خلاف ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں کہنا چاہیں تو وہ لوگ جنہوں نے یزید کی طرح اسلامی خلافت کے باوقار مقام کو غصب کر کے اسے بادشاہت میں تبدیل کیا اور اسلام کے مقدس نام پر اسلام کی جڑیں کاٹ کر اسلامی ڈھانچے کی تباہی کے لیے میدان تیار کیا، مسلمانوں میں اخلاقی فساد پھیلانے کے مراکز قائم کیے، ان پر نہ صرف لعنت اور نفرین جائز ہے بلکہ ان کو مسلمانوں کی صف سے نکال دینا چاہیے۔ جو شخص رسول خداؐ کے جگر گوشے، سلسلۂ اولیاء کے سردار کے پاکیزہ فرزند اور حضرت فاطمہ زہراؑ کے لختِ جگر کو ان کے بہت سے رشتہ داروں اور پیروکاروں کے ساتھ انتہائی ظلم کے ساتھ شہید کرے تو اس پر لعنت بھیجنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ اس گھناؤنے جرم سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنا ایک بہت ہی اچھا اور قابل ستائش عمل ہو گا۔ اس کے ساتھ تعاون کرنے والے اور ناحق اس کا دفاع کرنے والے بھی اس لعنت میں حصے دار ہونگے۔ تاریخ کے مسلم واقعات میں وسوسے پیدا کرنے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اب اس بحث کو مزید روشن کرنے کے لیے اس مسئلے پر شیعہ اور سنی علماء کی کتابوں سے جمع کیے گئے چند شواہد کی طرف رجوع کیا جائے گا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ وہ بات ہے جس پر سب مسالک متفق ہیں:

---

[1] احیاء العلوم، جلد 3، صفحہ 125۔

1۔ بارہا آئمۂ اطہارؑ کی تعلیم کردہ زیارتوں میں سانحہ کربلا اور سانحہ طف کے مجرموں پر لعنتیں بھیجی گئی ہیں۔ جیسا کہ زیارتِ عاشورا میں، جسے بعض صالحین اور بزرگان روزانہ، یا کم از کم عاشورا کے دن، پڑھتے ہیں، سانحہ کربلا کے اصلی ذمہ دار پر سو سے زیادہ بار لعنت کی گئی ہے اور ایک دفعہ اس کا نام صراحت کے ساتھ لیا گیا ہے۔

2۔ علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں نقل کیا ہے کہ: خدا تعالیٰ، جبرائیل، آدم، نوح، ابراہیم، اسماعیل، موسیٰ، سلیمان اور عیسیٰؑ نے حسینؑ کے قاتل پر لعنت فرمائی۔

3۔ فرات ابن ابراہیم کی تفسیر میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ رسول خداؐ نے حسین ابن علیؑ کے قاتل پر لعنت فرمائی۔

4۔ مشہور سنی عالم شبلنجی نے اپنی کتاب نور الابصار میں رسول اللہؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے حسین ابن علیؑ کے قاتل پر لعنت فرمائی ہے۔

5۔ اہلسنت کے امام احمد بن حنبل نے یزید کو کافر قرار دیا ہے اور ابن الجوزی جیسے لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے۔

6۔ ایک اور سنی عالم کی لکھی ہوئی کتاب اسعاف الرغبین میں روایت ہے کہ امام احمد بن حنبل نے نام لے کر یزید پر لعنت بھیجنا جائز سمجھا۔ ان کے مطابق حسین ابن علیؑ کے قاتلوں پر ان کا نام لئے بغیر لعن وطعن کرنے کے جواز پر تو تمام اہل علم کا اجماع ہے۔

7۔ ایک سنی عالم قاضی ابویعلی نے ان لوگوں پر ایک کتاب لکھی ہے جو لعنت کے مستحق ہیں اور یزید کو ان میں شمار کیا ہے۔

8۔ ابوالفرج ابن الجوزی، سنی علماء میں سے ایک، نے یزید کی لعنت کے بارے میں ایک کتاب لکھی، جس کا عنوان ہے: الرد على المتعصب العنيد، المانع من لعن يزيد۔

کیا غزالی جیسے متعصب فرد کی اندھی تقلید کرنے والے لوگ جو دونوں فرقوں کے عظیم مذہبی رہنماؤں اور عالموں کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہیں، اپنے کردار پر شرمندہ ہوں گے؟ اور یہ دلچسپ بات ہے کہ یہ لوگ مکاشفے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ملا محمد طاہر قمی نے تحفۃ الاخیار میں لکھا ہے کہ غزالی نے کسی جگہ کہا ہے کہ میں گوشہ نشینی، عزلت اور ریاضت میں مشغول ہوا اور صاحبِ کشف بن گیا۔

وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا[1] ترجمہ" :اور جو شخص ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور ہم اسے جہنم میں جھلسا دیں گے جو بدترین ٹھکانا ہے۔ "

2:بایزید بسطامی

بایزید بسطامی کا نام طیفور بن عیسیٰ بن آدم ہے۔ وہ 160 ہجری میں بسطام نامی قصبے میں پیدا ہوا جو خراسان میں ہے۔ اس کی وفات کے سال کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ اسے 234 ہجری لکھتے ہیں، کچھ اسے 264 ہجری لکھتے ہیں اور کچھ اسے 261 ہجری قرار دیتے ہیں۔ اس شخص کو

---

[1] سورہ نساء، آیت 115۔

صوفیاء میں ایک غیر معمولی مقام حاصل ہے، یہاں تک کہ اسے سلطان العارفین کا لقب دیا گیا ہے۔ شیخ عطار نے اپنی کتاب تذکرہ الاولیاء میں اسے برہان المحققین، خلیفۃ اللہ، علامۃ نامتناہی، اکبر مشائخ اور اعظم الاولیاء جیسے اہم القابات سے نوازا ہے۔ اسی کتاب میں وہ ابو سعید ابو الخیر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے: میں نے اٹھارہ ہزار دنیاؤں کو بایزید سے پُر دیکھا ہے اور بایزید ان میں سے نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ بایزید نے اپنے بارے میں جو دعوے کیے یا جو کچھ دوسروں نے اس کی طرف منسوب کیا، وہ کسی بھی عظیم پیغمبر کے بارے میں نہیں کہا گیا۔ بایزید عجیب و غریب خیالات رکھتا تھا جو بلاشبہ ہر سننے والے کو حیران کر دیتے ہیں۔

یہاں ہم شیخ عطار کی کتاب تذکرۃ الاولیاء سے اس کے چند کلمات مختصراً نقل کرتے ہیں اور فیصلہ معزز قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ ہم کچھ ایسی مضحکہ خیز کرامتوں کا بھی ذکر کریں گے جو اس کے عقیدت مندوں نے اس کی طرف منسوب کی ہیں تاکہ بات واضح تر ہو جائے۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص دو سال امام جعفر صادقؑ کے لیے بطور ماشکی پانی بھر کر لاتا تھا اور آپؑ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، سچ نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں تاریخ میں جو آیا ہے یہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔

1۔ بایزید کا فتویٰ: کہا جاتا ہے کہ ایک آدمی اس کے پاس آیا۔ بایزید نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: خدا کے گھر کی طرف حج کرنے جا رہا ہوں۔ اس نے کہا: تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے کہا: دو سو درہم۔ بایزید نے کہا: یہ مجھے دے دو، کیونکہ میں بال بچوں والا ہوں، اور میرے گرد سات چکر گھوم کر واپس جاؤ، یہی تمہارا حج ہے۔ اس شخص نے جیسا کہ بایزید نے کہا تھا ویسا ہی کیا اور واپس چلا گیا۔ جب یہ بات بسطام میں پھیل گئی اور شریعت کے علماء کو معلوم ہوا تو انہوں نے بایزید کو سات بار شہر سے نکالا۔ مؤلف کہتے ہیں: اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرنا دین اسلام کی ضروریات میں سے ہے، اور تمام علمائے اسلام کے نزدیک اگر ممکن ہو تو اسے ترک کرنا کسی بھی حالت میں جائز نہیں، اور جو لوگ اس ضروری حکم کا انکار کرتے ہیں ان کا حال معلوم ہے۔

2۔ اُس نے لوگوں کو اپنے آپ سے دور کرنے کیلئے زندقہ اپنایا: بایزید بیت اللہ کے راستے میں ایک شہر سے گزر رہا تھا کہ ایک گروہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: تمہارے ساتھی۔ بایزید کو یہ واقعہ پسند نہ آیا اور اس نے انہیں اپنے آپ سے دور کرنے اور اپنی محبت کو ان کے دلوں سے نکالنے کی کوشش کی۔ جب اس نے صبح کی نماز پڑھی تو ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: انی انا اللہ لا الہ الا انا فاعبدون، میں خدا ہوں، میری عبادت کرو۔ لوگوں نے کہا: یہ شخص پاگل ہے، اور اس سے الگ ہو گئے۔ مصنف کہتا ہے کہ کون سا مذہب اور تہذیب اجازت دیتی ہے کہ انسان کفریہ کلمات کے ذریعے لوگوں کو اپنے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کرے اور اپنے حلقے سے دور کرے۔

3۔ یحییٰ کو بایزید کا حکم: یحییٰ نامی ایک پختہ صوفی نے اس سے دستور العمل مانگا تو اس نے کہا: اگر تمہیں آدمؑ کی صفوت، جبرائیلؑ کی پاکیزگی، خلتِ ابراہیمؑ، شوقِ موسیٰؑ، طہارتِ عیسیٰؑ اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت عطا کریں تو مطمئن نہ ہونا، بلکہ اس سے آگے بڑھو اور ہمت والے بنو اور اپنا سر کسی چیز کی طرف نہ جھکاو، کیونکہ اگر تم کسی چیز کی طرف سر جھکاؤ گے تو تم محجوب ہو جاؤ گے۔ مصنف کہتا ہے کہ آپ نے دیکھا کہ وہ عظیم انبیاءؑ کے بلند مقام کو کیسے کم سمجھ رہا ہے اور ان مقامات کو حجاب سمجھ رہا ہے۔

4۔ جہنم کی آگ بجھانا: وہ کہتا تھا کہ کاش قیامت جلد آجائے تا کہ میں اپنا خیمہ جہنم کی طرف گاڑ سکوں تا کہ جب جہنم مجھے دیکھے تو ٹھنڈی ہو جائے اور اس طرح میں لوگوں کو آرام پہنچاؤں۔ مصنف کہتے ہیں : مشہور شیعہ عالم ابن ابی عقیل سے منقول ہے کہ جب ان کو یہ بات بتائی گئی تو انہوں نے فرمایا: جو شخص جہنم کی آگ کو اس طرح حقیر قرار دیتا ہے،واضح ہے کہ وہ اس پر بالکل ایمان نہیں رکھتا!

5۔ بایزید کا مرید: ایک دن حاتم اصم نے اپنے مریدوں سے کہا: تم میں سے جو کوئی قیامت کے دن جہنمیوں کی شفاعت نہیں کرے گا وہ میرا شاگرد نہیں ہو گا۔ یہ قول بایزید سے بیان کیا گیا،اس نے کہا: میرا شاگرد وہ ہے جو جہنم کے کنارے کھڑا ہو اور اس کے رہنے والوں کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں بھیجے اور خود ان کی جگہ لے۔ مصنف کہتا ہے: صوفیوں میں سے جو کوئی بایزید کا شاگرد بننا چاہتا ہے،بسم اللہ کرے!

6۔ بایزید کا نامناسب دعویٰ: شیخ عطار اپنی کتاب کے صفحہ 112 پر نقل کرتا ہے کہ بایزید سے کہا گیا: کیا قیامت کے دن لوگ حضرت محمدؐ کے پرچم تلے اکٹھے ہوں گے؟اس نے کہا: خدا کی قسم میرا جھنڈا محمدؐ کے جھنڈے سے بڑا ہے۔ اسی صفحہ پر نقل ہوا ہے کہ اس نے کہا: سبحانی ما اعظم شانی، منزہ ہوں میں، میرا مقام کتنا بلند ہے۔ یہ وہی جملہ ہے جو صرف خدا تعالیٰ کے بارے میں کہنا جائز ہے اور کسی فرشتے یا نبی نے اپنے لیے نہیں کہا ہے اور اپنے لیے یہ کہنے والا یقیناً منحرف ہے۔

7۔ درویش پگھل گیا: بایزید سے منسوب اور تذکرۃ الاولیاء میں بیان کی گئی مضحکہ خیز کرامات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک دن اس کے پاس ایک درویش آیا اور حیا کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے سوال کا جواب دیا تو اچانک درویش پگھل گیا۔ دروازے سے ایک مرید آیا اور زرد پانی سے بنی چیز کو زمین پر پڑے دیکھا اور کہا کہ اے شیخ یہ کون ہے؟ بایزید نے کہا: دروازے سے کوئی آیا اور حیا کے بارے میں سوال کیا اور میں نے اسے جواب دیا،وہ اسے برداشت نہ کر سکا اور یوں پگھل گیا!

8۔ شیطان کو پھانسی دینا: احمد خضرویہ جو تصوف کے پیروں میں سے تھا ایک دن بایزید کے پاس آیا اور کہا کہ اے شیخ!ابلیس کو آپ کے گھر کے سامنے پھانسی دے دی گئی ہے۔ اس نے کہا،ہاں،اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بسطام میں واپس نہیں آئے گا۔ اب اس نے کسی کو ورغلایا اور اس نے کسی کو قتل کر دیا۔ طے یہ ہوا کہ اسے ہمارے دربار پر پھانسی دی جائے۔

ایک اور مرید نے اس سے پوچھا: میں تمہارے پاس عورتوں کا ایک گروہ بیٹھا دیکھ رہا ہوں،یہ کون ہیں؟ بایزید نے کہا کہ یہ فرشتے ہیں جو مجھ سے علوم کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور میں ان کا جواب دیتا ہوں۔ مصنف کہتا ہے: یہ باتیں صحیح معنوں میں خرافات اور شیطانی خیالات ہیں۔ یہ صوفیوں کے کچھ رہنماؤں اور کشف و شہود کے چند دعویداروں کے حالات کی ایک جھلک تھی۔ یہ سب ان کی اپنی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔ کیا یہ نامناسب اور بے بنیاد باتیں، جو کبھی توہین آمیز ہوتی ہیں اور کبھی بچگانہ، اس بات کی روشن دلیل نہیں کہ اس قسم کے کشف سے حقیقت کی طرف کوئی راستہ نہیں کھلتا، بلکہ اس کے برعکس یہ حقیقت سے دوری اور گمراہی کا باعث ہے؟ چنانچہ ایک شاعر نے اس طرح کے انکشافات کے بارے میں درج ذیل اشعار کہے ہیں:

کشف چہ بود غیر اوہام و خیال — کی شود از وہم تحصیل کمال

گر کسی از کشف با ایمان شدی — محی دین ہم رتبۂ سلمان شدی

ور کہ کشف آئینۂ اسرار بود	سہروردی پیرو کرار بود

مرکب اندر راہ حق جز فہم نیست	کشفیان را مرکبی جز وہم نیست

ترجمہ: "موہومات اور خیالات کے سوا کشف کیا ہے؟ موہومات کب تحصیل کمال میں مددگار ثابت ہوئی ہیں؟ اگر کوئی کشف کی مدد سے باایمان ہو سکتا تو ابن عربی حضرت سلمان فارسیؓ کا ہم مرتبہ بن جاتا۔ اگر کشف اسرار کا آئینہ ہوتا تو سہروردی مولا علیؑ کا شیعہ ہوتا۔ صحیح راستے پر چلنے کا وسیلہ صرف عقل ہی ہے۔ کشف و شہود کے دعوے کرنے والوں کے پاس وہم کے سوا کچھ نہیں۔"

6۔ کشف کا امکان

اگرچہ پچھلی بحثوں میں ناقابل تردید دلائل کی بنیاد پر ثابت کیا گیا ہے کہ زیادہ تر مکاشفے اور خواب، جن کا صوفی طبقہ دعویٰ کرتا ہے، ان کا تعلق تخیل کی قوت اور وہم کے اظہار سے ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کو کبھی کبھار ہپنوسس اور نیند کی حالت میں، یا جسمانی اور ذہنی مشقت سے، کسی حقیقت کو سمجھنے میں مدد مل جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو ذاتی طور پر اس چیز کا تجربہ ہوا ہے اور معتبر لوگوں سے اس بارے میں کئی واقعات نقل ہوئے ہیں، جن کے ہوتے ہوئے اس معاملے کے مطلق انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور اسے اجمالاً قبول کیا جا سکتا ہے۔ تاہم دو باتوں کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے جو بہت اہم ہیں:

اول یہ کہ اگرچہ اجمالاً اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ساتھ ہی اس کی کوئی حد اور مقررہ میزان بھی نہیں ہے۔ یعنی ہم اجمالاً جانتے ہیں کہ یہ ایک ممکنہ اور قابل عمل کام ہے، لیکن ہم قطعی طور پر نہیں جانتے کہ کون، کن حالات میں اور کیسے حتمی طور پر یہ کام کر سکتا ہے۔

دوم یہ کہ اس میں بہت سی خرابیاں اور غلطیاں ہوتی ہیں، جن کے اسباب و علل بھی نامعلوم ہیں۔ ہمارے پاس صحیح اور غلط کشفیات میں فرق کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے مکاشفوں پر کسی بھی طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی اسے اپنی دلیل اور سہارا بنا کر اس پر اپنے نظریات اور عقائد کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ معاملہ (یعنی مخفی امور کا علم) صرف متقی اور پرہیزگار لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ لاابالی اور خدا فراموش لوگوں میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اس قول کے چند دلائل یہاں ذکر کیے جا رہے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اگر کسی کو پوشیدہ اور خفیہ چیزوں کی خبر مل جائے تو یہ کسی طرح بھی اس کے نیک ہونے یا خدا تعالیٰ سے قربت کی دلیل نہیں ہے۔ اگر آپ کو تعجب نہ ہو تو بعض اوقات اس کے برعکس ہوتا ہے۔

1: مرحوم محقق قمی نے اپنی کتاب جامع الشتات کے صفحہ 833 پر نقل کیا ہے کہ مشہور ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں ایک زندیق تھا جو غیب کی خبر دیتا تھا۔ امامؑ نے اس سے پوچھا کہ یہ مقام کہاں سے حاصل کیا؟ اس نے کہا: نفس کی خواہشات کی مخالفت کے نتیجے میں۔ آپؑ نے پوچھا: کیا اسلام تمہارے نفس کی خواہشات کے مطابق ہے یا اس کے خلاف؟ فرمایا: یہ نفس کی خواہشات کے خلاف ہے۔ آپؑ نے فرمایا: پس تم دین اسلام کو قبول کرو تاکہ تم اپنے نفس کی مخالفت کرو۔ اس شخص نے غور کیا اور اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں اس سے لوگ جو پوچھتے تھے وہ اسے

نہیں بتا پاتا تھا۔ اس نے امامؑ سے کہا کہ جب میں کافر تھا تو چھپے ہوئے امور کی خبر دیتا تھا، اب کیا ہوا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور مجھے ان کا علم نہیں؟!

امامؑ نے فرمایا: "اسلام کی اہمیت ان معمولی امور کے ثواب سے زیادہ ہے۔ جب تم کافر تھے تو تمہارا صلہ (دنیا میں) چھپے ہوئے معاملات کا علم تھا اور تم اسی پر مطمئن تھے۔ اب جب کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے، اس کا ثواب دوسری دنیا پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ وہی نعمتیں اسلام کا اجر و ثواب ہو سکتی ہیں۔"

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ ریاضتوں اور نفس کی مخالفت بے اثر نہیں ہے، اور خاص طور پر وہ لوگ جو ایمان کی کمی یا احکام شریعت کی مخالفت کی وجہ سے آخرت کے ثواب کے مستحق نہیں ہیں ان کی مشقت کا بدلہ اس دنیا میں ہو گا، جس کی ایک شکل مختلف باتوں کو جان لینا ہے۔

2: مرحوم مجلسی نے سطیح کاہن کے حالات میں، جو کہ زمانۂ جاہلیت کے کاہنوں میں سے ایک تھا، نقل کیا ہے کہ وہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے وصیؑ کی ولادت باسعادت اور ان کی خصوصیات سے ان کی ولادت سے پہلے آگاہ ہو گیا تھا اور اس نے حضرت ابوطالبؑ کو مبارک باد دی تھی۔ نیز بحار الانوار کی چھٹی جلد میں زرقاء یمامہ کا ذکر ہے جو زمانۂ جاہلیت کا ایک اور کاہن تھا اور اس نے بھی پیغمبرِ اسلامؐ کے ظہور کے قریب ہونے کی خبر دی تھی۔ مختصر یہ کہ احادیث اور تواریخ کی کتابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایسے لوگ موجود تھے جنہیں کاہن کہا جاتا تھا، جو بعض معاملات کی خبر دیتے تھے۔

مرحوم محدث قمی نے سطیح کے حالات میں ابوالحسن البکری سے نقل کیا ہے کہ اسے رات کو بہت کم نیند آتی تھی اور وہ مسلسل آسمان کے تاروں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اسے حکمرانوں کے درباروں میں بلایا جاتا تھا اور اس سے مختلف چیزوں کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔ وہ انہیں ان کے دل کے راز بتاتا اور مستقبل میں ہونے والے سیاسی و سماجی واقعات کی پیش گوئی کرتا۔ امام علیؑ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کا ایک سخت مخالف جس کا نام عمرو بن حریث تھا، جب آپ سے غیب کی خبر سنتا تو اسے کہانت قرار دیتا تھا۔ اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ کہانت کا شمار عربوں کے دورِ جاہلیت کے اہم ترین موضوعات میں ہوتا تھا اور اس کی یادیں اسلام کے ابتدائی دور میں موجود تھیں۔

3: میرے (مصنف کے) ایک قابل اعتماد دوست نے مجھے یہ واقعہ شیراز کے ایک محترم شخص کے حوالے سے سنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب میں ہندوستان گیا تھا تو کچھ عرصے تک اپنے خاندان کے بارے میں کوئی خبر نہ مل سکنے پر بہت پریشان تھا۔ میرے ایک جاننے والے نے مجھے ایک ہندو مرتاض سے ملوایا تاکہ اس سے کچھ معلومات حاصل کر لوں۔ جیسے ہی اس مرتاض نے مجھے دیکھا تو فوراً میرا نام پکارا اور کہا کہ آپ کا خاندان مسجد نصیر الملک کے قریب آپ کے سابقہ گھر سے دوسری جگہ، دروازۂ کازرون، چلا گیا ہے۔ اب آپ کے گھر میں ایک جشن کی مجلس ہو رہی ہے، اور آپ کا ایک بچہ ابھی سیڑھیوں سے گرا ہے اور اس کے سر پر ہلکی سی چوٹ آئی ہے، لیکن اس کے علاوہ کوئی اور حادثہ پیش نہیں آیا۔ میں نے اس دن کی تاریخ کو یاد کر لیا، بعد میں جب میں نے دوبارہ شیراز جا کر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہندو مرتاض کی باتیں بالکل واقع کے مطابق تھیں۔

مصنف کہتا ہے: اس طرح کے واقعات جن میں ہندوستان کے بت پرست مرتاضوں نے کوئی انوکھا کام کیا ہوتا ہے، کثرت سے بیان کیے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے انہیں دیکھا یا سنا ہے۔ لہٰذا اگر اتفاقاً کسی کی طرف سے ایسے اعمال نظر آئیں تو انہیں اس کے ایمان کی درستی اور عقیدے

کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن انبیاءؑ کے معجزات کا مسئلہ ایک اور موضوع ہے جسے علمِ کلام کے ماہرین نے نبوت کی بحث میں بیان کیا ہے، اور اس کی شرائط بیان کی ہیں، اور ایسے اعمال اور معجزات میں فرق کرنے کا راستہ واضح کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب پیامِ قرآن کی ساتویں جلد میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

7۔ الٰہی مکاشفات

کشف کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو خدا کے اولیاء اور پاکیزہ انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ انبیاء اور معصومینؑ کی تعلیمات کے سایے میں نفس کو پاک کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ پردے اٹھ جاتے ہیں اور انسان غیب کے پردے کے پیچھے چھپے رازوں کو سمجھتا ہے اور مکمل یقین، اطمینان اور سکون حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا حساب صوفیاء کے کشف سے بالکل الگ ہے۔ اس بارے میں مزید وضاحت پیامِ قرآن کی پہلی جلد میں پیش کی گئی ہے۔

باب چہارم: صوفیوں کی عجیب و غریب ریاضتیں

اس سے پہلے کہ صوفیوں کے ہاں رائج ایک اور انحراف، یعنی ریاضت، پر گفتگو کی جائے، چند جملوں میں زندگی کے مظاہر اور مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں اسلام کے عمومی نظریئے کا خلاصہ بیان کرنا اچھا رہے گا۔

اسلام کا ایک بنیادی اصول، جس نے اسے ایسا زندہ اور ابدی دین بنا دیا ہے جو پوری دنیا کیلئے قابل عمل ہے، اعتدال کا خیال رکھنا اور ہر چیز میں کمی یا زیادتی کو روکنا ہے۔ اسلام افراط اور تفریط کو جہالت کی نشانی اور اعتدال اور میانہ روی کو "علم" کی علامت سمجھتا ہے۔ جیسا کہ ہم اسلام کے عظیم رہنما حضرت علیؑ کے اقوال میں سے ایک میں پڑھتے ہیں: لا تجد الجاہل الا مفرطا او مفرّطا[1]، ترجمہ: "تم جاہل کو ہمیشہ یا افراط میں پاؤ گے یا تفریط میں۔" جاہل ہمیشہ یا اتنی تیزی سے جاتا ہے کہ ہدف سے آگے نکل جاتا ہے اور یا وہ اتنا سست ہوتا ہے کہ منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ اسلام نے نیند، خوراک، لباس، آرام اور تفریح اور مختصر یہ کہ دنیاوی لذتوں اور اہم عنایات کے استعمال کے معاملے میں اس اصول کی مکمل پابندی کی ہے اور ان میں افراط و تفریط کی مذمت کی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تقویٰ، گناہوں سے اجتناب، تزکیۂ نفس، اخلاقی اوصاف کو حاصل کرنے اور دنیا میں اللہ کی نعمتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے چلنے اور اللہ کے قریب جانے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہتا ہے: ان نعمتوں کو پیدا کرنے میں اللہ تعالی کا اصل مقصد اس کے مومن بندے تھے۔

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ قُلۡ ہِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا خَالِصَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ.[2] ترجمہ: "کہہ دیجئے: اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا؟ کہہ دیجئے: یہ چیزیں دنیاوی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی، ہم اسی طرح اہل علم کے لیے آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں۔"

تاہم چونکہ اسلام کے نقطہ نظر سے دنیا کی زندگی عمومی طور پر آخرت کا پیش خیمہ ہے۔ روحانی کمالات اور دوسری دنیا کی سعادت کے حصول کا ذریعہ مادی چیزوں کو اس حد تک استعمال کرنا ہے کہ یہ یا تو انسان کو کمال کی راہ پر گامزن کریں یا کم از کم اس میں رکاوٹ نہ بنیں۔ لہٰذا اسلام نے مادی لذتوں میں حد سے زیادہ دلچسپی اور خواہشات میں غرق ہونے کے خلاف سخت جنگ کی ہے جو دل کو مردہ کر دیتی ہیں اور انسان کو تخلیق کے اصل ہدف سے روکتی ہیں، جو روحانی کمالات کا حصول ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے دو صورتوں میں ان لذتوں سے لطف اندوز ہونے کو مکمل طور پر ممنوع یا محدود کر دیا ہے:

1۔ اگر یہ ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں تو اس صورت میں سختی سے روکا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: العبادۃ سبعون جزءاً افضلہا طلب الحلال، "عبادت کے ستر حصے ہیں جن میں سب سے افضل حلال رزق کی تلاش ہے۔"[3]

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت 61۔

[2] سورہ اعراف، آیت 32۔

[3] وسائل الشیعہ، جلد 12۔

2۔ ایسے معاملات میں جہاں دوسرے مسلمان مشکلات اور دباؤ میں ہوں، اسلام ہمیں غیر ضروری اخراجات کم کرنے اور ضرورت مندوں اور محروموں کی ہر ممکن مدد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ امیر المومنینؑ کے زہد کی ایک وجہ اس چیز کا دھیان رکھنا بھی تھی۔ جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں: ”کیا میں اس میں مگن رہوں کہ مجھے امیر المؤمنین کہا جاتا ہے مگر میں زمانہ کی سختیوں میں مومنوں کا شریک و ہمدم اور زندگی کی بد مزگیوں میں اُن کے لئے نمونہ نہ بنوں۔ میں اس لئے تو پیدا نہیں ہوا ہوں کہ اچھے اچھے کھانوں کی فکر میں لگا رہوں۔ اُس بندھے ہوئے مغلوب چوپایہ کی طرح جسے صرف اپنے چارے ہی کی فکر لگی رہتی ہے یا اُس کھلے ہوئے جانور کی طرح جس کا کام منہ مارنا ہوتا ہے، وہ گھاس سے پیٹ بھر لیتا ہے اور جو اُس سے مقصد پیش نظر ہوتا ہے اُس سے غافل رہتا ہے۔ کیا میں بے قید و بند چھوڑ دیا گیا ہوں؟ یا بیکار کھلے بندوں رہا کر دیا گیا ہوں کہ گمراہی کی رسیوں کو کھینچتا رہوں اور بھٹکنے کی جگہوں میں منہ اٹھائے پھرتا رہوں۔“[1]

اور یہ کہ ہم بعض روایتوں میں دیکھتے ہیں کہ حلال چیزوں میں بھی زہد پر عمل کرنا چاہیے، کیونکہ دنیا کے حلال وسائل کا بھی حساب ہوگا۔ شاید اس سے یہ مراد ہو کہ انسان کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ انسان مادی لذتوں میں مشغول ہو جائے اور تخلیق کے عظیم مقصد سے غافل ہو جائے۔ اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ حلال میں بھی افراط و تفریط نہ ہو۔ تاہم صوفیوں کی ریاضتیں کسی بھی طرح سے اوپر کہی گئی باتوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ وہ شریعت اور عقل کی حدود سے باہر ہیں، اور ان کی نامناسب بدعات میں سے ہیں، جن میں سے اکثر شرمناک اور ذلت آمیز یا خطرناک اور پاگل پن پر مبنی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین خود فیصلہ کر سکیں۔

1۔ صوفیاء کی عجیب ریاضتوں کی مثالیں

ریاضت، مادی لذتوں کو ترک کرنا اور سخت مشقت کرنا تصوف کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے جو ان کے تمام فرقوں میں بعض اختلافات کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں تک کہ جو فرقے اسلام سے پہلے موجود تھے، اور خاص طور پر ہندو، جن میں تصوف قدیم زمانے سے موجود ہے، وہ بھی کافی حد تک تصوف کی یہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ بعض صوفیاء نے ریاضت کے ایسے اعمال بیان کیے ہیں جو عقل کو حیران کر دیتے ہیں۔ شیخ عطار اپنی تذکرۃ اولیاء میں لکھتا ہے:

1: لاٹھیوں کی گٹھڑی سے خود کو مارنا: روایت ہے کہ شبلی کے پاس ایک کوٹھری تھی جس میں وہ رہتا تھا اور لکڑیوں کا ایک گٹھا اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ جب بھی وہ لاپرواہی محسوس کرتا تو اس سے اپنے آپ کو پیٹتا تھا۔ بعض اوقات تمام ڈنڈے ٹوٹ جاتے تھے تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں دیوار پر مارتا تھا۔[2]

خدا کی قسم، کون سی عقل، منطق یا مذہب کسی شخص کو اپنے آپ کو لاٹھی سے مارنے کی اجازت دیتا ہے، اور شبلی یہیں پر بس نہیں کرتا، دیوار پر ہاتھ پاؤں مارتا ہے؟! اگر، خدا نہ کرے، آپ کا کوئی قریبی شخص ایسا کچھ کرے، تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ کیا آپ اسے دماغی ہسپتال نہیں بھیجیں گے؟

حیرت ہے کہ ڈاکٹر غنی بظاہر ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس قصے کو بیان کرنے سے پہلے وہ کہتا ہے: ”مکمل ذکر اور ورد اور ان کی لازمی شرط یعنی کامل توجہ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور راستے بتائے گئے ہیں، اور ان صوفی بزرگوں کے طرزِ عمل کے بارے میں واقعات بیان کیے گئے

---

1 نہج البلاغہ، مکتوب 45۔

2 تذکرۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 235۔

ہیں جن کی زندگی اہلِ سلوک کیلئے سر مشق ہے"۔[1] اس کے بعد وہ یہ قصہ بیان کرتا ہے۔ کیا کبھی انبیاءؑ، اولیاء اللہ اور آئمہ اطہارؑ کے اصحابؓ میں سے کسی کی زندگی میں ایسی ناشائستہ اور جنونیت پر مبنی حرکتیں دیکھی گئی ہیں؟!

2: کنویں میں الٹا لٹکنا: شیخ ابو سعید کے حالات میں، جو ایک مشہور صوفی ہے اور صوفیاء کے نزدیک بہت بڑا درجہ رکھتا ہے، ہم یہ پڑھتے ہیں: "جوانی میں رات کو گھر والوں کے سوجانے کے بعد وہ آہستہ سے اٹھتا اور مسجد میں آتا۔ مسجد کے کونے میں پانی کا کنواں تھا۔ وہ ایک لاٹھی کے بیچ میں رسی باندھتا اور رسی کے دوسرے سرے کو پاؤں سے باندھ دیتا۔ پھر وہ لاٹھی کنویں کے منہ پر رکھتا اور صبح تک کنویں کے بیچ میں قرآن کی تلاوت کرتا رہتا۔ رات کے آخر میں وہ کنویں سے باہر نکلتا اور چپکے سے گھر میں داخل ہوتا تاکہ اس کے والدین کو پتہ نہ چلے!"[2]

ایک اور جگہ آیا ہے کہ شیخ ابو سعید ابوالخیر نے درخت کے نیچے ایک شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اے نوجوان! یہ درخت جو تم دیکھ رہے ہو میں نے اس پر الٹا لٹک کر اسیٔ مرتبہ قرآن ختم کیا ہے۔"[3] ایک ایسا مذہب جو کہتا ہے کہ: وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ.[4] ترجمہ: "اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔" حتیٰ کہ اہم مذہبی عبادات اور دینی فرائض جیسے کہ روزہ رکھنے سے بھی اس وقت روکتا اور منع کرتا ہے جب وہ نقصان دہ ہو۔ وہ مذہب کیا کبھی کسی کو ایسے جاہلانہ اور خطرناک کام کرنے کی اجازت دے گا؟ کیا اس بے راہ روی کے ذریعے کمال حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا کوئی عقلمند اس بات کو مانے گا؟

3: اپنی آنکھوں میں سات من نمک ڈال دیا: ابوبکر شبلی، جو کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں گزرا ہے، کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب اس نے پہلی بار ریاضت کا بیڑا اٹھایا تو کئی سال تک رات کو اپنی آنکھوں میں نمک ڈالا کرتا تاکہ وہ سو نہ سکے، اور کہتے ہیں کہ اس نے اپنی آنکھوں میں سات من نمک ڈالا تھا۔[5] یہ تو بڑی پتھریلی آنکھیں تھیں!

4: سات سال تک صحرا کے کانٹے کھائے: ابو سعید کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس نے سات سال صحرا میں ریاضت کی اور معروف ہے کہ ان سات سالوں میں اس نے صحرا کے کانٹے اور جھاڑیوں کے پتے وغیرہ کھائے۔[6] کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرزِ زندگی سے انسان کا ذہن سالم رہتا ہے؟

5: صوفی کا لباس: کتاب استوار نامہ میں ریاضت کے وقت صوفی کے پہننے کے لباس کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو بیان کرنے سے پہلے اس کتاب کے مصنف کے بارے میں بات کرنا کوئی مناسب ہوگا۔ استوار نامہ کیوان قزوینی کی تصنیف ہے، جنہیں منصور علی شاہ کہا جاتا ہے۔ سترہ

---

[1] ڈاکٹر غنی، تاریخ تصوف، صفحہ 361

[2] اسرار التوحید فی مقامات ابی سعید سے اقتباس، صفحہ 22

[3] تذکرۃ الاولیاء، جلد 2، صفحہ 329۔

[4] سورہ بقرہ، آیت 195۔

[5] تذکرۃ الاولیاء، جلد 2، صفحہ 164۔

[6] اسرار التوحید، صفحہ 27۔

سال تک پیر بنے رہنے کے بعد اور اپنے گرد تین ہزار عقیدت مند مرید جمع کرنے کے بعد، خوفِ خدا اور ضمیر کی بیداری اور روحانی ہمت کی وجہ سے انہوں نے اس دھندے سے منہ موڑ لیا اور تصوف کے اقطاب خصوصاً گنابادی سلسلے کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کیلئے ایک نفیس کتاب استوار نامہ لکھی۔ وہ استوار نامہ کے مقدمے میں لکھتے ہیں" : تین ہزار غلام نما مرید جو میری طرف سے اپنے وجود، نعمتوں اور خوشیوں کو میری عطا کردہ سمجھتے تھے اور اپنی تمام ظاہری اور باطنی صلاحیتوں اور اپنی جان و مال سے مجھے راضی کرنے کی کوشش کرتے تھے، ایک بڑے بت کی طرح میری پرستش کرتے تھے۔ میں نے ان کو اپنے سے دور کیا۔ اب جب کہ مجھے ریاضت اور خلوت کو چھوڑے ہوئے 12 سال ہو چکے ہیں، اگر میں واپس آ کر پیر کی کرسی پر بیٹھوں تو سب میرے فرمانبردار اور وفادار بن جائیں گے اور پھر سے عقیدت کے جال میں پھنس کر اپنے حریفوں پر اطاعت کا رعب جمائیں گے۔ ہر شخص اپنے اختیاری کام میں ایک اہم فائدہ دیکھتا ہے جو اس کام کی تکلیف اور نقصان کو اٹھانا ممکن بناتا ہے۔ پیری مریدی کی ذلت کو چھوڑنے میں مجھے ضمیر کی معنوی عزت ملی اور روح اور دین کی ذمہ داری بھی ادا ہوئی۔"

اس کے علاوہ مذکورہ شخصیت نے اپنی کتاب میں صوفی اکابرین کے اپنے مریدوں کے ساتھ برتاؤ اور مریدوں کے صوفیوں سے ملنے کے طریقوں کے بارے میں حیران کن باتیں لکھی ہیں، جن کا وہ برسوں تک تجربہ اور مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ وہ صوفی اکابرین کی ریاضت کے بارے میں بھی دلچسپ باتیں لکھتے ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ:"اور لباس میں پرانے کپڑے پہننے ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کو کم کرتا رہنا ہوتا ہے یہاں تک کہ جلد ہی لباس بن جائے۔ اسی لیے انہیں صوفی کہا جاتا ہے اور صرف شرمگاہ کو ڈھانپنا یا مرقع یعنی لوگوں کا پرانا چھوڑا ہوا کپڑا اکٹھا کر کے سلائی کر کے پہننا ہوتا ہے۔ یہی خرقہ اور مرقع بن جاتا ہے۔"

مصنف کہتا ہے: جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، صوفیوں میں ریاضت کے طریقوں پر بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر ہم کچھ فرقوں میں ریاضت کی کچھ قسمیں نہیں دیکھتے، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے ہاں دوسرے طریقے نہیں ہیں۔ بطورِ کلی صوفی بزرگوں کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے سخت ریاضت کی کوئی حد مقرر نہیں کی تھی اور جو کچھ بھی ان کے خیال میں مخلوق سے دوری اور خالق سے قربت کا طریقہ ہوتا، خواہ وہ گناہ ہی کیوں نہ ہو، اسے انجام دیتے تھے۔ غزالی کے الفاظ میں وہ بعد میں اس ظاہری گناہ کی تلافی کریں گے۔

مسلسل 20 سال تک نہانے کو ترک کرنے کا مسئلہ بھی بعض صوفیانہ تعلیمات میں بیان ہوا ہے۔ بعض کے ہاں دھوپ میں اتنی دیر کھڑے رہنا ملتا ہے کہ جسم سے تیل زمین پر گرنے لگے۔ بعض صوفیوں کے حالات میں رات سے صبح تک سر کے بل کھڑا ہونے جیسی ریاضت ملتی ہے۔ ان کاموں کا مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ایسی حرکتیں ناجائز ہونے کے ساتھ ساتھ احمقانہ بھی ہیں جن سے ہر بیدار ضمیر اور عقل نفرت کرتا ہے۔

6: چالیس دن میں حیوانیت ترک کرنا: چالیس دن یا اس سے زیادہ مدت کیلئے حیوانیت کو چھوڑنے کا مسئلہ صوفیاء کی سادہ اور عام ریاضتوں میں سے ہے جو ان میں سے اکثر کے ہاں رائج ہے۔ یہ مسئلہ بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ، مولا علیؑ اور دیگر آئمہؑ سے متعدد روایات اس فعل کی مذمت میں نقل ہوئی ہیں۔

شیخ حر عاملی مرحوم نے کتاب وسائل الشیعہ، جو کہ ہمارے مشہور مصادرِ حدیث میں سے ایک ہے، کی تیسری جلد میں اس موضوع پر معصومینؑ سے دس احادیث نقل کی ہیں: من ترک اللحم اربعین صباحا ساء خلقه، یعنی جس نے چالیس دن تک گوشت نہ کھایا اس کا اخلاق بگڑ جاتا

ہے۔ متعدد احادیث میں ایسے شخص کے کان میں اذان دینے کا حکم دیا گیا ہے جو گوشت نہ کھاتا ہو۔ اس سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ شخص اسلام کے احکام سے بھٹک گیا ہے، اس لئے آپ کو اذان کے ساتھ اس کے ایمان کو تازہ کرنا چاہیے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایسے شخص کو اگر قرض لینا پڑے تو قرض لے کر گوشت کھائے اور خدا اس کا قرض ادا کرے گا۔ طبی لحاظ سے بھی لمبی مدت تک گوشت نہ کھانا صحت کیلئے نقصان دہ ہے۔ جیسا کہ گوشت خوری میں افراط بھی نقصان دہ ہے۔ واضح ہے کہ جب کوئی انسان جسمانی یا ذہنی انحراف کا شکار ہوتا ہے تو اس کے اثرات اس کے اخلاق اور اس کی فکر پر پڑتے ہیں۔ شاید ان احادیث سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو۔ اس بنا پر چالیس دن تک زندگی کے حیوانی پہلوؤں کو ترک کرنا نہ صرف انسان کو خدا کے قریب نہیں کرتا بلکہ اخلاق پر برے اثرات مرتب کرتا ہے اور روح اور جسم کا اعتدال اور توازن بگاڑ کر مزاج میں گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔

2۔ ریاضت کے بارے میں اسلام کی منطق کی ایک مثال

ہم سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام ایک سماجی اور آفاقی مذہب ہے جو زندگی کی واقعیتوں پر استوار ہے اور انسان کی حقیقی نشوونما اور خرافات اور موہومات کے پردے چاک کرنے پر قائم ہے۔ واضح ہے کہ ایسا مذہب ان ریاضتوں کے خلاف جنگ کرے گا جن کی مثالیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام کے عظیم رہنماؤں کی گفتگو اور طرز عمل کی ایک روشن مثال وہ ہے جو نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی زبانی نقل ہوئی ہے اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلیمات اور صوفیاء کی تعلیمات میں زمین سے آسمان تک کا فاصلہ ہے۔

بصرہ میں مولا علیؑ اپنے ایک صحابی علاء ابن زیاد حارثی کے ہاں عیادت کیلئے تشریف لے گئے تو اس کے گھر کی وسعت کو دیکھ کر فرمایا:

”تم دنیا میں اس گھر کی وسعت کو کیا کرو گے؟ درآنحالیکہ آخرت میں تم گھر کی وسعت کے زیادہ محتاج ہو (کہ جہاں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے)۔ ہاں! اگر اس کے ساتھ تم آخرت میں بھی وسیع گھر چاہتے ہو تو اس میں مہمانوں کی مہمان نوازی، قریبیوں سے اچھا برتاؤ اور موقع و محل کے مطابق حقوق کی ادائیگی کرو۔ اگر ایسا کیا تو اس کے ذریعے آخرت کی کامرانیوں کو پالو گے۔“

علاء ابن زیاد نے کہا کہ: ”یا امیر المومنینؑ! مجھے اپنے بھائی عاصم ابن زیاد کی آپؑ سے شکایت کرنا ہے۔“ حضرتؑ نے پوچھا: ”کیوں، اسے کیا ہوا؟“ علاء نے کہا کہ: ”اس نے بالوں کی چادر اوڑھ لی ہے اور دنیا سے بالکل بے لگاؤ ہو گیا ہے“۔ حضرتؑ نے کہا کہ: ”اسے میرے پاس لاؤ“۔ جب وہ آیا تو آپؑ نے فرمایا کہ: ”اے اپنی جان کے دشمن! تمہیں شیطان خبیث نے بھٹکا دیا ہے، تمہیں اپنی آل اولاد پر ترس نہیں آتا؟ اور کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے جن پاکیزہ چیزوں کو تمہارے لئے حلال کیا ہے اگر تم انہیں کھاؤ برتو گے تو اسے ناگوار گزرے گا؟ تم اللہ کی نظروں میں اس سے کہیں زیادہ گرے ہوئے ہو کہ وہ تمہارے لئے یہ چاہے۔“

اس نے کہا: "یا امیر المومنینؑ! یہ آپؑ کا پہناوا بھی تو موٹا جھوٹا اور کھانا روکھا سوکھا ہوتا ہے؟" تو حضرتؑ نے فرمایا: "تم پر حیف ہے! میں تمہارے مانند نہیں ہوں۔ خدا نے آئمۂ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں، تاکہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائے۔"[1]

یہ گفتگو اسلام کی منطق اور زندگی میں افراط و تفریط کو روکنے کے لیے جو ہدایات دی گئی ہیں اس کی واضح مثال ہے۔ کیونکہ امام علیؑ سب سے پہلے علاء ابن زیاد کے گھر میں داخل ہوئے اور اس کی وسعت اور شان و شوکت سے حیران رہ گئے اور اسے اعتدال کی نصیحت کی اور دوسری طرف اس کے بھائی کو سخت ڈانٹ پلائی جو تفریط کرنے والا تھا۔

1 نہج البلاغہ، خطبہ 207، ترجمہ: مفتی جعفر حسینؒ

باب پنجم: خانقاہوں کی لذت پرستیاں اور ہوس رانیاں

یہ عجیب بات ہے کہ صوفی اگرچہ جسمانی ضرورتوں سے اجتناب کے حق میں ہیں لیکن کچھ مادی لذتوں کے لیے ایک عجیب حرص اور طمع کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گانے، موسیقی اور رقص کی خواہش کا مسئلہ، جو ان میں وجد اور سماع کے ناموں سے جانا جاتا ہے، ان چیزوں میں سے ایک ہے جس کے صوفی فرقوں میں بہت سے حامی ہیں، خاص طور پر نغمے گانا، جو اکثر خانقاہوں میں عام رہا ہے۔

خانقاہوں میں رفت و آمد رکھنے والے لوگوں نے نوعمر اور خوبصورت نوجوانوں کے نغموں کی بہت سی داستانیں بیان کی ہیں جو ان نام نہاد اللہ والوں کو سمعی اور بصری لذتیں پہنچاتے ہیں۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو خدا کی طرف توجہ اور جذب اور شوق کی وادیوں کو عبور کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو صوفیوں کی مشہور کتابوں میں آیا ہے۔

1۔ ابو سعید کا رقص

کتاب "اسرار التوحید فی مقام ابو سعید" میں بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عبد اللہ باکو جو کہ صوفیوں کا ایک بزرگ ہے، شیخ ابو سعید کے سماع اور دھمال کا منکر تھا اور کبھی کبھار اس کا اظہار بھی کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک رات اسے خواب میں آواز آئی: قوموا و ارقصو لله، یعنی اٹھو اور اللہ کے لیے ناچو۔ وہ جاگا اور لاحول پڑھا اور کہا یہ کوئی پراگندہ خواب تھا جو شیطان نے دکھایا۔ دوسری بار پھر خواب میں آواز آئی: قوموا و ارقصوا لله، پھر جاگا اور لاحول پڑھا۔ ذکر اذکار کیئے اور قرآن سے دو تین سورتوں کی تلاوت کی۔ پھر سویا اور وہی خواب دیکھا۔ اب اس نے فیصلہ کیا کہ یہ ضرور حق ہے۔ صبح اٹھا اور ابو سعید کو ملنے گیا اور دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں یہ پڑھ رہا ہے: قوموا و ارقصوا لله، "اٹھو اور اللہ کی رضا کے لیے رقص کرو"۔ وہاں شیخ ابو عبد اللہ کا وقت اچھا گزرا اور اس کے دل میں ابو سعید کے وجد اور سماع کے بارے میں جو انکار تھا وہ جاتا رہا۔[1] مصنف کہتا ہے: یہ صحیح معنوں میں ہر چیز کو کھیل بنا لینا اور ہر خواہش اور ہوس کو مذہب کے لبادے میں چھپانا ہے۔ ہاں، جو کہتا ہے: راس ہذا الامر کبس المحابر و خرق الدفاتر و نسیان العلوم، یعنی "تصوف کا آغاز دواتیں توڑنا، کاپیاں پھاڑنا اور علوم کو بھول جانا ہے"[2]، ایسے شخص کے لیے اللہ کی رضا کے نام پر ناچنا کوئی تعجب کی بات نہیں، ابو بکر شبلی کی سوانح عمری میں لکھا ہے: روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ کئی دن تک ایک درخت کے نیچے رقص کرتا رہا اور ہو ہو کہتا رہا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا، اس درخت پر یہ فاختہ کو کو کہتی ہے اور میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں اور ہو ہو کہتا ہوں۔[3]

---

[1] اسرار التوحید، صفحہ 93؛ جامی، نفحات الانس، صفحہ 322۔

[2] اسرار التوحید، صفحہ 33۔

[3] عطار، جلد 2، صفحہ 138۔

2۔ رقص کو نماز سمیت ہر کام پر فوقیت!

ابو سعید ابو الخیر کے مریدوں میں سے ایک نے اس کے حالات میں لکھا: ایک دن دعوت کے بعد دھمال ڈال رہے تھے اور ہمارا شیخ ایک خاص حال میں تھا اور سب اسی حالت میں تھے۔ مؤذن نے نمازِ ظہر کے لیے اذان دی مگر شیخ ابھی بھی اسی حال میں تھا اور مجمع پر جوش وجد میں تھا، رقص ہو رہا تھا اور شور مچایا جا رہا تھا۔ اسی حال میں مولوی محمد قاینی، جو اس محفل کا میزبان تھا، نے کہا: نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ شیخ نے کہا: ہم نماز میں ہیں، جبکہ وہ دھمال میں تھا۔ مولوی نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا اور نماز پڑھنے لگا۔[1] مصنف کہتا ہے: یہ اس شخص کا انجام ہے جو اپنی عنان شیطان کے حوالے کر دے۔ کہا گیا ہے کہ اردبیل کے رباط میں دو سو صوفی رہتے تھے اور ان کا کام مفت کا لنگر کھانا اور ناچنا تھا۔[2] رومی کہتا ہے:

در ہوای عشق حق رقصاں شوند   ہمچو قرص بدر بی نقصان شوند

صوفیاء میں اس کا رواج اس حد تک تھا کہ ابو العلاء معری نے اپنے اشعار میں صوفیوں کی لنگر خوری اور ناچنے کا مذاق اڑایا ہے۔ اس موضوع پر ابو العلاء کا قطعہ مشہور ہے:

آری جیل التصوف شرّ جیل   فقل لهم و اهون بالحلول

آقال الله حين عبدتموه   كلوا اكل البهائم و ارقصوا لی؟[3]

صوفیاء میں ایسے بھی تھے جو قرآن سے زیادہ شاعری اور گائیکی سے متاثر ہوتے تھے۔ جیسا کہ یوسف بن الحسین رازی ان اشعار کے اثر سے رو پڑتا تھا جو قوال اپنے خاص انداز اور ولولے سے پڑھتے تھے، لیکن قرآن پڑھتے وقت اس پر ایسی حالت طاری نہیں ہوتی تھی۔[4]

ڈاکٹر زرین کوب لکھتے ہیں: ”یہی وہ نکتہ تھا جس نے صوفیوں کو سماع اور قوالی کی محفلوں کی طرف کھینچا۔ ان محفلوں میں قوالی ہوتی تھی، جس میں آلات کے ساتھ یا ان کے بغیر عشقیہ یا صوفیانہ گیت گائے جاتے تھے اور صوفی زمین پر ایک دائرے میں خاموشی اور سکون سے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ سر جھکائے، سانس روکے رہتے تھے تاکہ محفل کی خاموشی اور سکوت میں خلل نہ پڑے۔ تاہم اس سارے جوش و خروش کے درمیان یہ خاموشی اور سکون یقیناً زیادہ دیر قائم نہیں رہتا تھا۔ اچانک کوئی صوفی وجد میں آجاتا تھا۔ وہ داد دیتا، نعرہ لگاتا اور ناچنے لگتا۔ اس کا یہ جوش دوسروں تک بھی سرایت کر جاتا اور وہاں موجود شیخ بھی بعض اوقات پر جوش ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناچنے لگتا۔ اس طرح وہاں موجود تمام لوگ تالیاں بجانے اور دھمال ڈالنے لگتے۔ ان صورتوں میں بعض اوقات عجیب و غریب صورت حال بھی پیش آجاتی تھی۔ کوئی صوفی اپنا لباس پھاڑتا، دوسرا چیختا چلاتا، اور شاید کبھی کبھار ایک یا دو لوگ شدید جذبات سے ہلاک بھی ہو جاتے۔“

جامی نے نفحات الانس میں شیخ روزبہان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اس کی کتاب کشف الاسرار میں آیا ہے کہ ایک قوال کو اچھی شکل و صورت کا ہونا چاہیے، کیونکہ سماع میں صوفیوں کا دل لگانے کیلئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: اچھی خوشبو، خوبصورت چہرے اور اچھی آواز۔ مصنف کہتا

---

[1] اسرار التوحید، صفحہ 186۔

[2] آثار البلاد قزوینی، صفحہ 290۔

[3] ارشاد، جلد 2، صفحہ 185۔

[4] اللمع، 36304۔

ہے: جب انسان صوفیاء کی مذمت میں آنے والی احادیث پڑھتا ہے تو بعض اوقات ان کی مذمت میں سختی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے، لیکن جب وہ ان کی گندی حرکتوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ بھی کم ہے۔

3۔ خانقاہ کی رسوائیوں کی ایک اور انتہا

کچھ صوفیوں پر اپنی شادی کو ترک کرنے اور نوعمر لڑکوں کے ساتھ جنسی حرکتیں کرنے کی وجہ سے بچہ بازی (pedophilia) کا الزام بھی لگا۔ بلاشبہ درگاہوں پر جانے والے نوجوان لڑکوں سے دوستی کرنا تصوف کی پرانی آفات میں سے ایک ہے۔ حتیٰ کہ بعض بڑے بڑے شیوخ سے بھی لڑکوں سے جنسی کھیل کھیلنے جیسا کام منسوب ہے۔ احمد غزالی خوبصورت نوجوانوں کے سامنے ماتھا ٹیکا کرتا تھا۔ اوحد الدین کرمانی نوخیز لڑکوں کے ساتھ خفیہ تعلقات رکھتا تھا اور وجد کے غلبے کی صورت میں ان کے سینے سے اپنا سینہ لگاتا تھا۔ خلیفہ کے بیٹے کے ساتھ اس کا چکر مشہور ہے اور کہا جاتا ہے کہ شمس تبریزی نے ان معاملات میں اس پر تھوڑا سا اعتراض بھی کیا۔[1] فخرالدین عراقی ایک خوبصورت قلندر لڑکے کے پیچھے عراق سے ہندوستان چلا گیا۔[2] اس حوالے سے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ خانقاہیں ایسے نوجوانوں سے بھری ہوتی تھیں۔ بہت سے صوفی پیروں نے لوگوں کو لونڈے بازی کے جال سے خبردار بھی کیا۔[3] بہرحال نوجوان لڑکوں کا یہ شوق بھی صوفیاء سے عمومی نفرت اور ان پر اعتراض کی ایک وجہ رہی ہے۔[4] مصنف کا کہنا ہے کہ نہ صرف لوگوں کی نفرت، بلکہ خدا اور مخلوق کی نفرت!

---

[1] ارزش میراث صوفیہ، صفحہ 154۔

[2] کلیات عراقی، مقدمہ، صفحہ 49و50۔

[3] عرضِ مترجم: حلاج پر اس کے دوست سمری کی بیٹی نے جسمانی قربت کا الزام لگایا تھا۔ (تاریخ بغداد، جلد 8، صفحہ 129 تا 131۔)۔ سرمد کاشانی، جو ملا صدرا شاگرد تھا، ایک ہندو لڑکے ابھے چند پر عاشق ہوا اور اس کے ساتھ ننگا گھومنے لگا۔ وہ خود کو حلاج کا پیروکار کہتا تھا۔ اسکا شعر ہے:

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　　من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

[4] ارزش میراث صوفیہ، صفحہ 155۔

باب ششم: شیخ، پیر اور مرشد

سابقہ بحثوں سے اجمالاً یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ صوفیاء عموماً اپنے پیروکاروں کو مختلف احکامات دیتے ہیں جو کہ بہت سے معاملات میں نہ تو عقلی معیار پر پورے اترتے ہیں اور نہ ہی شرعی معیارات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کی مثالیں ریاضت اور کشف و شہود وغیرہ کی بحث میں واضح ثبوتوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اپنے پیروکاروں سے ان احکامات کو منوانے کے لیے اور ان کو اپنے احکامات کا ہر لحاظ سے پابند کرنے کے لیے یہ لوگ پیروں فقیروں کے لیے مطلق اختیارات کے قائل ہیں۔

اس سلسلے میں صوفیاء کی منطق یہ ہے کہ سالک الی اللہ کو راستے کی خطرناک وادیوں سے باحفاظت گزرنے کے لیے اور نفسانی خطرات اور شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لیے اور ذہنی کشمکش اور اضطراب سے آزاد ہونے کے لیے کسی رہبر اور رہنما کا انتخاب کرنا چاہئے، کیونکہ یہ راستہ خطرناک ہے اور اس کو طے کرنا ان کی ہمراہی کے بغیر ممکن نہیں جو پہلے اسے طے کر چکے ہیں۔

قطع این مرحلہ بی ہمرہی خضر مکن	ظلمات است، بترس از خطر گمراہی!
گزرت بر ظلمات است، بجو خضر رہی	کہ در این مرحلہ بسیار بود گمراہی

صوفی اس رہنما کو قطب کہتے ہیں اور عموماً یہ لقب کسی ایسے شخص کو دیتے ہیں جو ان کے خیال میں سیر و سلوک میں مکمل خود کفیل ہو اور اسے کسی رہنما یا رہبر کی ضرورت نہ ہو۔ تاہم اگر اسے ابھی تک مکمل خود کفالت نہیں ملی ہے تو وہ اسے شیخِ مجاز کہتے ہیں جس نے کسی قطب سے مریدوں کو اللہ کی طرف لے جانے کی اجازت حاصل کی ہو۔ صوفی عام طور پر اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر چیز بشمول افعال اور الفاظ (حتیٰ وہ جو اذکار کہتے ہیں) شیخ، قطب اور رہنما کی اجازت سے ہونی چاہیے۔ جو ذکر اور افعال اس کی اجازت کے بغیر کیے جائیں، وہ روحانی مقامات کے حصول میں کوئی مدد نہیں کریں گے۔ ان کے پیر اور شیوخ بھی ایسے ڈاکٹر کی طرح جو ایک خاص مقدار اور معیار میں ایک مقررہ وقت پر مختلف دوائیں کھانا یا ٹیکے لگوانا تجویز کرتا ہے، کہتے ہیں: فلاں فلاں ذکر روزانہ چالیس دن تک فلاں فلاں بار کہو، پھر اسے ترک کر دو، اور فلاں ذکر کہو۔ شاید وہ خود بھی اس تشبیہ کو پسند کرتے ہیں اور اپنے آپ کو روحانی ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔

لیکن کیا خدا کا ذکر، جو ہر حال میں اور ہر صورت میں اچھا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ معصومینؑ کی ہدایات میں تمام لوگوں کو (بغیر استثناء) کئی اچھے اذکار کی طرف بلایا گیا ہے، جن میں خدا کی یاد اور اس کے خوبصورت ناموں اور صفات کی طرف توجہ کرنا شامل ہے، کیا یہ کوئی ایسی چیز ہیں جو کچھ لوگوں کے مزاج کے مطابق درست ہوں اور دوسروں کے مطابق نہ ہوں؟ اگر یہ صحیح ہے تو رسول اللہؐ اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث میں یہ بات کیوں نہیں بتائی گئی؟ انہوں نے اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کو الگ الگ دستور العمل کیوں نہ دیا؟

1۔ مرشد کے اختیارات کی وسعت کہاں تک؟

بہر صورت تصوف کے نقطہ نظر سے پیر کے پاس انتہائی وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ استوار نامہ کے مصنف کیوان قزوینی عرف منصور علی شاہ، جو کبھی خود صوفی پیر ہوتے تھے، لکھتے ہیں کہ مرشد کی خود ساختہ ولایت ان دس جھوٹے دعوؤں پر محیط ہوتی ہے:

اول : مجھے خاتم الانبیاءؑ کی باطنی ولایت حاصل ہے۔ انہوں نے تصوف کے احکام مرتب کئے۔ میرے اور ان میں فرق بس یہ ہے کہ وہ اس کے بانی ہیں اور میں اس کا فروغ دینے والا، مدیر اور سرپرست ہوں۔

دوم : میں لوگوں کی ایک جماعت کو اس طرح مکمل کر سکتا ہوں کہ میں بدکار روحوں کو ان کے جسموں میں مار دوں یا ان کے جسموں سے نکال کر کافروں کے جسموں میں ڈال دوں۔

سوم: میں فطرت اور نفس کی پابندیوں سے آزاد ہوں۔

چہارم: مریدوں کی تمام عبادات اور معاملات میری اجازت سے ہونے چاہئیں۔

پنجم : کوئی بھی نام جو میں مریدوں کو دوں اور انہیں دلوں میں یا زبان پر کہنے کی اجازت دوں تو وہی خدا کا اسم ہے، باقی سب اذکار معتبر نہیں ہیں۔

ششم: وہی عقائد اور دینی معارف درست ہیں جن کی میں تائید کروں، ورنہ وہ غلط ہیں۔

ہفتم: میری اطاعت لازم، میری خدمت کرنا واجب اور میری حفاظت ضروری ہے۔

ہشتم: میں اپنے عقائد میں آزاد ہوں۔

نہم: میں ہر وقت مریدوں کے قلبی معاملات میں حاضر و ناظر ہوں۔

دہم: میں جنت اور جہنم کی تقسیم کرنے والا ہوں۔[1]

بلاشبہ یہ عقائد ہر ایک صوفی فرقے کے نہیں ہیں لیکن ان کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس چیز کا اجمالاً اندازہ ہو جائے کہ یہ پیروں کیلئے کس قسم کے اختیارات کے قائل ہیں۔ صوفیوں کو پیر اور قطب کے حکم کے خلاف چون و چرا کرنے یا بحث کرنے کا کوئی حق نہیں، اور ان کی ذرا سی بھی مزاحمت گویا ارتداد شمار ہوتی ہے۔ شاید ایسی صورت حال کیلئے ہی سرسپردگی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یعنی پورے خلوص سے اپنا سب کچھ ایک پیر یا مرشد کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس کی چوکھٹ پر ہتھیار ڈال کر کہتے ہیں:

اگر مخلصی سر بر این در بنہ　　　　کلاہ خداوندی از سر بنہ

بہت سے صوفیاء کا تو یہ خیال ہے کہ سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے مرشد کے چہرے کو ہر وقت ذہن میں رکھے اور اس سے غفلت نہ کرے۔ چنانچہ حاج زین العابدین شیروانی، جو اس فرقے کے کٹر حامیوں میں سے ہے، اپنی کتاب ریاض السیاحۃ کے صفحہ 155 پر لکھتا ہے: ”اس حال میں سالک کو چاہیے کہ وہ تمام حالات، افعال اور اقوال میں پیر کے چہرے سے غافل نہ ہو۔ ذکر، ورد، تلاوت، اطاعت اور خدمت کے دوران اپنے شیخ کے چہرے کو نظر انداز نہ کرے۔ تاکہ وہ سالک کو تخیل کی کشمکش اور اضطراب سے بچائے اور اس کے نتیجے میں وہ شیطانی وسوسوں اور خطرات نفسانی سے دوچار نہ ہو۔“

---

[1] استوارنامہ، صفحات 95 تا 106، با تلخیص۔

ان عجیب وغریب اختیارات کی وجہ سے جو انہوں نے اپنے آپ کو دے رکھے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ عمومی طور پر یا خاص لوگوں کے لیے شریعتِ مقدسہ کے کچھ احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کریں۔ چنانچہ میرے ایک معتبر دوست نے بیان کیا کہ ایک صوفی گروہ باقاعدگی سے مغرب یا عشاء کی نماز میں خاموشی سے پڑھتا ہے۔ میں نے تحقیق کی تو انہوں نے بتایا کہ ایک فقیر روحانی ارتکاز اور رغبت کی حالت میں تھا اور دوسرا اس کے پاس مغرب یا عشاء کی نماز میں مشغول تھا اور بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔ فقیر کے مزاج پر ناگوار گذرا۔ جب پیر نے یہ سنا تو سب کو حکم دیا کہ وہ نماز میں سورتیں آہستہ پڑھیں، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی اور فقیر پر خاص حالت طاری ہونے میں رکاوٹ بنیں۔ مختصر یہ کہ صوفیوں کے ہاں ایک بہت سخت نظم و ضبط غالب ہے، جو مارشل لاء کی حکومت یا انتہا پسند جماعتوں کے نظم و ضبط سے بھی بدتر ہے۔ فرق یہ ہے کہ جماعتی نظم و ضبط (جیسے کمیونسٹ پارٹیوں کا سخت ڈسپلن) میں صرف اعمال اور طرزِ عمل کو کنٹرول کیا جاتا ہے، لیکن یہاں عقائد اور افکار کو بھی یہ وسوسہ پھیلا کر کنٹرول کیا جاتا ہے کہ پیر دل کے حالات سے آگاہ ہے۔ تاہم، بعض معاملات میں صوفی پیر اپنے مریدوں کو کھلی چھوٹ دیتے ہیں، جیسا کہ کتاب کی ابتداء میں اشارہ ہوا۔

2۔ قطب اور مرشد کی شناخت کا طریقہ

بہت سے صوفیوں کا خیال ہے کہ مرشد کو نیند اور ہپنوسس یا ٹرانس (trance) کی حالت میں پہچانا جانا چاہیے اور اس کا غلام بن جانا چاہیے۔ اس لیے وہ خوابوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اپنے خوابوں کو بڑے ذوق و شوق سے بیان کرتے ہیں اور محفلوں میں "واقعات یا مکاشفوں" کی صورت میں سناتے ہیں۔ چونکہ وہ خوابوں میں بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں اسلئے وہ خواب بھی بہت زیادہ دیکھتے ہیں۔ کشف اور شہود، یا وجدان، پر بحث کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان کا تخیل بھی بہت قوی ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بھی ان کو عجیب وغریب خواب نظر آنے کا سبب ہوتی ہے۔

1: میرے شمس، میرے خدا

یہاں مولوی رومی کے ان اشعار کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہو گا جو اس نے اپنے پیر و مرشد شمس تبریزی کے بارے میں کہے ہیں۔ یہ دیوان شمس میں موجود ہیں اور شمس کے بارے میں اس کی عقیدت کی حد کو نمایاں کرتے ہیں۔ صوفیاء میں رومی اور شمس کے مقام کے پیشِ نظر یہ اشعار موجودہ بحث کے لیے ایک اچھی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ شمس تبریزی کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے:

پیر من و مراد من، درد من و دوای من — فاش بگفتم این سخن: شمس من و خدای من
شہپر جبرئیل را طاقت آن کجا بود؟ — کز تو نشان دہد مرا شمس من و خدای من
عیسی مردہ زندہ کرد دید فنای خویشتن — زندہ جاودان تویی شمس و من و خدای من
کعبہ من کنشت من دوزخ من بہشت من — مونس روزگار من شمس من و خدای من
از در مصر تا بہ چین گفتہ وہای ہوی من — گفتہ شمس دین بخوان شمس من و خدای من[1]

ان اشعار کا محتویٰ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ ان میں اتنا غلو کیا گیا ہے اور اتنی لمبی لمبی چھوڑی گئی ہے کہ ہر مومن کو نفرت اور کراہت ہو گی۔ مولوی رومی اپنی کتاب مثنوی میں مرشد یا ولی کے بارے میں کہتا ہے :

---

[1] کلیات شمس تبریزی، صفحہ 623، چھاپ ہندوستان۔

آزمایش تا قیامت دائم است | پس بہ ہر دوری ولیی لازم است
پس امام حی قائم آن ولی است | خواہ از نسل عمر خواہ از علی است
مہدی وہادی وی است ای راہ جو | ہم نہان و ہم نشستہ پیش رو

ترجمہ: ”آزمائش قیامت تک ہے تو ہر زمانے میں ولی ہونا چاہئے۔ وہی ولی زندہ و مطلق امام ہے، چاہے عمر کی نسل سے ہو یا علیؑ کی۔ اے راہ حق کی جستجو رکھنے والے، وہی مہدی اور وہی ہادی ہے۔ وہ غائب بھی ہے اور حاضر بھی ہے۔“ یہ اشعار بھی صوفیوں کی ہاں امامتِ نوعی اور مرشد کے عقیدے کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار کی حدود کو کس قدر وسیع اور لامحدود سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار میں بارہ آئمۂ اہل بیتؑ کی طرف اشارہ نہیں ہے، کیونکہ یہ جملہ، خواہ وہ نسلِ عمر سے ہو یا نسلِ علیؑ سے، بات کو صاف کر دیتا ہے۔[1]

2: اس طرزِ فکر کے خطرات

صوفیاء کے قطب، شیخ اور پیر کے بارے میں مذکورہ عقائد ہر لحاظ سے خطرناک ہیں، کیونکہ:

اولاً: اس قسم کا عقیدہ شخصیت پرستی کا مظہر ہے اور بالآخر شرک کی طرف لے جاتا ہے۔ جس طرح قطب و مرشد کی شکل کو سامنے رکھنا، حتیٰ اللہ کی عبادت کے دوران، چاہے اسے خالق کا کامل مظہر سمجھا جائے، شرک کی ایک قسم ہے۔ کس قدر اختلاف ہے اس عقیدے میں اور معصومینؑ کے اقوال سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے۔ انبیائے الٰہی اور آئمۂ اطہارؑ نے کبھی کسی کو ایسا حکم نہیں دیا، بلکہ انہوں نے لوگوں کو کہا کہ وہ کسی واسطے کو بیچ میں لائے بغیر خدا کی ذات کی طرف توجہ کریں۔ جی ہاں! اسلامی توحید ہر قسم کے شرک اور بشر پرستی کے ایسے مظاہر کا مقابلہ کرتی ہے!

ثانیاً: صوفی پیر اس سے بہت ناجائز فائدے اٹھا سکتے ہیں اور ذہنی غلاموں پر اپنی مرضی کے مطابق اصول و ضوابط نافذ کر سکتے ہیں، جیسا کہ وہ کرتے رہے ہیں۔ اگر اس بات پر بھی غور کیا جائے کہ زیادہ تر پیر اور مرشد ناخواندہ ہیں اور ان کے پاس صحیح علم نہیں ہے، اس صورت حال کا خطرہ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ مریدوں کا پیروں کو ایسے خیالی عہدوں پر بٹھانا بندر کے ہاتھ میں پستول تھمانے کے مترادف ہے۔

ثالثاً: صوفیاء اپنے پیروں کے ان لامحدود اختیارات اور بہت سارے عہدوں اور مقامات کے لیے کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں رکھتے۔ بعض اوقات وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں: کونوا مع الصادقين، ”سچوں کے ساتھ ہو جاؤ“۔[2] بعض اوقات اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں:

وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَ لَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَ کَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا[3]. ترجمہ: ”اور (اے رسول) اپنے آپ کو ان لوگوں کی معیت میں محدود رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اپنی نگاہیں ان سے نہ پھیریں، کیا آپ

[1] عرضِ مترجم: آیۃ اللہ العظمیٰ نوری ہمدانی کہتے ہیں: ”مذہبِ امامیہ میں اولیاء کچھ خاص شخصیات ہیں۔ ہم ولایتِ شخصی کے قائل ہیں جو پیغمبرؐ اور آئمہؑ میں منحصر ہے، جن کے نام متواتر احادیث میں آئے ہیں۔ صوفی ولایتِ نوعی کے قائل ہیں، لہٰذا پیروں کو حجتِ خدا سمجھتے ہیں۔ کتاب تذکرۃ الاولیاء میں انکے نام آئے ہیں۔“ (درس خارج فقہ، کتاب الوقف، 16/11/95۔)

[2] سورہ توبہ، آیت 119۔

[3] سورہ کہف، آیت 28۔

دنیاوی زندگی کی آرائش کے خواہشمند ہیں؟اور آپ اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔"

کبھی امام جعفر صادقؑ کے اس قول کا حوالہ دیتے ہیں:

مَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَاعِظٌ مِنْ قَلْبِهِ وَ زَاجِرٌ مِنْ نَفْسِهِ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ قَرِينٌ مُرْشِدٌ اسْتَمْكَنَ عَدُوَّهُ مِنْ عُنُقِه.[1] ترجمہ: "جس کے دل میں وعظ و نصیحت کرنے والا، اور جس کے نفس کے اندر روک ٹوک کرنے والا اور ایک ہمدرد مرشد نہیں ہو گا، اس کا دشمن اس کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔"

واضح ہے کہ ان دونوں آیات اور روایتوں میں سے کوئی بھی یہ معنی نہیں رکھتی کیونکہ سچوں کے ساتھ ہونے کا مطلب کسی مرشد کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہر گز نہیں ہے، نہ ہی پیروں کو واجب الاطاعت سمجھنا ہے۔ اسی طرح خدا کے نیک بندوں اور متقی افراد کی صحبت کا پیری مریدی، خانقاہ جانے، خرقہ پوشی، جتھے بندی وغیرہ سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

اتفاق سے یہ روایت بھی ان کے خلاف دلیل ہے کیونکہ اس میں "من نفسه" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب خوف خدا کی باطنی حالت ہے۔ دوسرے لفظوں میں زیر نظر روایت حکم دیتی ہے کہ ہر شخص کے پاس بیدار ذہن، پختہ ایمان، اخلاقی صفات اور اچھا دوست ہونا چاہیے جو اسے انحراف سے روکے، ہمیشہ نیکی اور خیر کی طرف دعوت دے۔ اس کا مرشد اور قطب کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور بلا چون و چرا اطاعت سے کیا تعلق؟ ایسا لگتا ہے کہ ان کی غلط فہمی کی وجہ روایت میں لفظ مرشد کا استعمال ہے، لیکن لگتا ہے کہ وہ یہ نہیں جاننا چاہتے کہ یہ لفظ رہنما کے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، صوفیوں کے اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مرشد ڈھونڈنے کے سلسلے میں صوفیاء خوابوں کیلئے جس اہمیت کے قائل ہیں اس کا تو ذرہ برابر بھی شرعی یا عقلی اعتبار نہیں ہے۔

3: اس بارے میں علمائے اسلام کی رائے

سنی علماء کرام پیغمبر اسلام (ص) کے بعد مذہبی احکام و ہدایات میں کتاب اللہ اور سنت، یعنی قرآن اور رسول اللہؐ کی احادیث، کے علاوہ کسی اور مآخذ کو تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ بعض اوقات وہ عقلی دلیل اور اجماع کو بھی بنیاد بناتے ہیں۔ شیعہ علماء اپنے دین کے حقائق کو حدیثِ ثقلین کی روشنی میں، جو کہ متواتر حدیث ہے اور ہدایت کے وسیلے کو قرآن و عترت میں منحصر کرتی ہے، ان دو عظیم مآخذوں سے اخذ کرتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کے بعد وہ صرف آئمۂ اہل بیتؑ کی ولایتِ مطلقہ پر یقین رکھتے ہیں۔ بارہویں امام حجۃ ابن الحسن عسکری، ہماری جانیں ان پر قربان ہوں، کی غیبت کے بعد وہ چار افراد کو خاص نائب تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے بعد کوئی نہیں ہے جو عبادات و احکام یا اخلاقیات و روحانیت یا اذکار و اوراد یا روزمرہ کے معاملات میں دین کا مآخذ ہو سوائے ان فقہاء کے جو ان کے مکتب کے تربیت یافتہ ہوں اور اسلام کے معارف کو معتبر منابع سے اخذ کر سکیں۔ ان مراجع کو نیابتِ عامہ حاصل ہے۔ انہیں مجتہد کہا جاتا ہے اور ان کی پیروی کی شرط اجتہاد کی صلاحیت کے علاوہ تقویٰ اور عدالت ہے۔ لہٰذا کوئی بھی کسی کو اس بہانے سے اپنی طرف دعوت نہیں دے سکتا کہ فقہاء صرف فقہ میں مرجع ہیں لیکن نام نہاد طریقت کے مراجع الگ ہیں۔ شریعت، طریقت اور

---

[1] شافی، صفحہ 652۔

حقیقت جو بھی ہو، اس کا مآخذ معصومین ؑ کو ہونا چاہیے۔ یہ کہنا کہ ہم مجتہدین سے "فقہ" لیتے ہیں اور ناخواندہ یا کم پڑھے لکھے لوگوں سے "طریقت" حاصل کرتے ہیں جن کے پاس سوائے جھوٹے دعوؤں کے کچھ نہیں ہوتا، بڑی توہین اور جسارت ہے۔ دوسرے لفظوں میں: ذکر و فکر اور عبادت کا کوئی بھی عمل جسے طریقت کا نام دیا جائے، شریعت میں حکم رکھتا ہے۔ جو چیز کسی انسان کے لیے فائدہ مند ہے، اسے واجب یا مستحب کے طور پر بیان گیا ہے۔ جو چیز نقصان دہ ہے اسے حرام یا مکروہ قرار دے کر اس سے روکا گیا ہے۔ اس صورت میں کسی اور کی رائے کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس طرح اسلام نے اپنے آسمانی احکام کے گرد ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی ہے اور ان کے لیے محافظ مقرر کیے ہیں اور انہیں عقلمند دشمنوں اور نادان دوستوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آنکھ بند کر کے دوسرے کی تقلید کرے اور اس کے خیالات، خواہشات اور میلانات کے مطابق قدم اٹھائے۔ کتاب و سنت کے احکام کے علاوہ جو احکام بتائے جائیں وہ بدعت اور گمراہی ہیں اور اسلام ان کی پیروی کرنے والے کو باطل کا راہی سمجھتا ہے۔ لہٰذا اسلام کی ثقافت میں "قطب"، "مرشد" اور "پیر" کی کوئی جگہ نہیں۔ اگر وہ واقعی مجتہد اور اہلِ استنباط ہیں تو وہ فقہاء کی صف میں ہوں گے اور اگر وہ نہ ہوں، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، تو ان کی پیروی گناہ، خطا اور انحراف ہے۔

3۔ تفسیر بالرائے اور ضابطہ شکنی

صوفیاء کی خطرناک بدعتوں میں سے ایک رائے سے تفسیر کرنے کی راہ پر چل نکلنا اور الفاظ سے کھیلنا ہے۔ وہ حدود و قیود اور الفاظ و معانی کے پابند نہیں ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لغت اور ادب و گفتگو کے ضوابط کا خیال رکھے بغیر الفاظ کو کسی معمولی مناسبت کی وجہ سے اپنے من پسند مطالب کے کسی سلسلے سے جوڑ دیتے ہیں۔

آپ نہیں بھولے ہوں گے کہ ہم نے صوفیوں کے بزرگوں میں سے ایک کا واقعہ نقل کیا ہے کہ اس نے کہا کہ موسیٰ ؑ کے اپنے بھائی ہارون ؑ پر غصہ کرنے اور یہ کہنے: مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۔ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِىْ،[1] یعنی "جب آپ دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں تو میری پیروی کرنے سے آپ کو کس چیز نے روکا؟ کیا آپ نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟" کا مطلب تھا کہ آپ نے انہیں بچھڑے کی پوجا کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی اور انہیں کیوں روکا؟[2] ظاہر ہے کہ یہ بیان صریحاً آیت کریمہ کے مفہوم کے متضاد ہے۔ اس آیت سے ایسا مفہوم نکالنے کے لیے لفظوں سے کتنا کھیلنا پڑے گا؟ اسی طرح کی عجیب و غریب تشریحات صوفیوں کی کتابوں میں بکثرت موجود ہیں۔ اس میں صوفی اکیلے نہیں ہیں، دوسرے منحرف فرقے بھی اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنے میں ان ساتھ شریک ہیں۔

یہ واضح ہے کہ یہ رجحان تمام مذہبی پیغامات، تعلیمات، ہدایات، معارف اور حقائق میں ایک عجیب انتشار پیدا کرتا ہے اور ان سب کی قدر و قیمت کو ختم کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اکثر مطالب کی تاویل ممکن ہوتی ہے اور ہر آیت اور روایت کو جس معنی کے مطابق چاہیں ڈھال سکتے ہیں۔ قرآن واضح طور پر کہتا ہے: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ،[3] یہ واضح عربی زبان میں نازل ہوا۔ قرآن روشن عربی میں اترا، جسے ہر کوئی سمجھ سکتا

---

[1] سورہ طٰہٰ، آیت 93۔

[2] ابن عربی، فصوص الحکم، فص ہارونیہ، صفحہ 295۔

[3] سورہ شعراء، آیت 195۔

تھا۔ یعنی جس طرح لوگ ایک دوسرے کو اپنی باتیں پہنچاتے ہیں، قرآن بھی حقائق کو ایسے بیان کرتا ہے۔ البتہ قرآن ایسا ہے کہ جتنا اس پر غور کیا جائے گا اتنا ہی نیا مواد زبانی معیارات اور قواعد سے ہٹنے کی ضرورت کے بغیر حاصل ہو گا۔ دوسری طرف قرآن نے متشابہات پر عمل کرنے سے منع کیا ہے

:ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ ۚ؃ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ؏ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.[1] ترجمہ: "وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں، وہی اصل کتاب ہیں، اور کچھ متشابہ ہیں۔ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ جب کہ اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں جو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں، یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔"

اور یہ صوفیانہ طرزِ فکر کے باطل ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پہلے دن سے ہی الفاظ اس لیے بنے ہوتے ہیں کہ لوگ ان کو ان معنوں میں استعمال کریں جن پر سب کا اتفاق ہو اور یوں اپنے مقاصد کا اظہار کر سکیں۔ ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کریں۔ قرآن و احادیث کے الفاظ گہرے اور با معنی ہونے کے باوجود متفقہ زبانی ضوابط کی حدود سے باہر نہیں ہیں۔ اگرچہ قرآن کا باطن پیغمبر اکرمؐ اور آئمۂ معصومینؑ سے مخصوص ہے۔ اگر من پسند تاویلات اور تفسیر بالرائے کا دروازہ کھل جائے تو ممکن ہے کوئی کہے کہ قرآن میں جہاں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم چور کو اتنی نصیحت کریں اور اس قدر ضروری مالی امداد دیتے رہیں کہ وہ آئندہ چوری کرنا چھوڑ دے۔ ایک زانی کو سو کوڑے مارنے کی سزا کا مفہوم یہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہم اس کو سو مرتبہ ملامت اور سرزنش کریں اور روحانی کوڑے ماریں۔ جہنم کے عذاب کے معنی اس کے لذیذ پانی کو پینا قرار دیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے شیطان کے آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کو اس کے کمالِ توحید کا اظہار کہہ دیا جائے۔ اتفاقاً بعض صوفی شیطان کو رئیس الموحدین کہتے ہیں۔ یقیناً اس صورت میں تمام اسلامی تعلیمات اور تمام ضوابط اور احکامات کی قدر ختم ہو جائے گی اور حدیں ٹوٹ جائیں گی۔ یہاں پر یہ کہنا چاہیے کہ صوفی فرقے کی بڑی خامیوں میں سے ایک تفسیر بالرائے اور ضابطہ شکنی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہمیں ساری زندگی کبھی اپنے حال پر نہ چھوڑے اور ہدایت کے راستے پر ہمیں ثابت قدم رکھے !

تمام شد

---

[1] سورہ آل عمران، آیت 7۔